© rasailojaraid.com

ہندوؤں کے ساتھ

سلطان فیروز شاہ تغلق کا برتاؤ

(کچھ جدید مورخین کے خیالات کا تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

ہندوستان میں مسلمانوں کا زمانۂ حکومت عہد وسطیٰ کے نام سے جانا جاتا ہے پھر اسے عہد سلطنت و عہد مغلیہ دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے پہلا حصہ ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک محیط ہے جس میں سلطان قطب الدین ایبک سے سلطان ابراہیم لودی تک کا زمانۂ حکومت شامل ہے دوسرا حصہ بابر سے اورنگ زیب تک کے عہد بادشاہت پر مشتمل ہے جو ۱۵۲۶ء سے ۱۷۰۷ء تک پھیلا ہوا ہے گرچہ اسے رسمی و دستوری طور پر ۱۸۵۷ء یعنی بہادر شاہ ظفر کے آخری زمانہ تک محیط مانا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کے لیے مذہبی و ثقافتی اور سیاسی و سماجی مختلف حیثیتوں سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کے مطالعہ میں بڑی دلچسپی پائی جاتی رہی ہے اور موجودہ ہندوستان میں مثبت و منفی دونوں پہلوؤں سے یہ دلچسپی کچھ اور زیادہ بڑھ گئی ہے ایک جانب اس زمانہ کے انداز سیاست، نظم حکومت، مذہبی و تمدنی اور سماجی و معاشی حالات کو جاننے و سمجھنے کی سنجیدہ علمی کوششیں جاری ہیں، دوسری جانب اہلِ وطن کے ایک طبقہ کی مسلسل تگ و دو یہ ہے کہ اس عہد کی تاریخ کو مسخ کر کے اس کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کی جائے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ اُس عہد کے حکمرانوں سے نفرت پیدا ہو بلکہ ان کے ہم مذہبوں کے سلسلہ میں بغض و عداوت کے جذبات برانگیختہ ہوں، اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورتحال میں وقت کی اس اہم ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ میں دلچسپی لی جائے اور اس زمانہ کے واقعات وحالات اور سیاسی وانتظامی اقدامات کا معروضی مطالعہ کرکے تاریخ کی صحیح عکاسی کی جائے اور تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی کوششوں کو ناکام بنایا جائے اور یہ بہتر ہوگا کہ اس طرح کے مطالعہ کے نتائج کو ملک کی مختلف زبانوں میں منظر عام پر لایا جائے تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو واقفیت ہوسکے۔

سب سے پہلے اس امر کی جانب توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت سے متعلق ایک بنیادی غلط فہمی یہ پھیلائی جاتی ہے کہ مسلم حکمرانوں میں جو دینی رجحان رکھتے تھے اور حکومت کے نظم ونسق میں شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے کوشاں تھے۔ ان کے یہاں غیر مسلموں کے ساتھ تعصب وتنگ نظری اور غیر منصفانہ رویہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ مزید براں دینی جذبہ اور قانون شریعت کے نفاذ کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ تعصب وتنگ نظری اور غیر مسلموں کے ساتھ بے جا سختی ہے۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت عہد سلطنت کے معروف سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۰-۱۳۸۸ء) اور دور مغلیہ کے بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) ہندوؤں کے ساتھ زیادتی اور غیر منصفانہ برتاؤ کے لیے سب سے زیادہ ہدف تنقید بنائے جاتے ہیں اور یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ یہ دونوں ہی مذہبی رجحان رکھتے تھے اور انھوں نے شرعی قوانین کی روشنی میں حکومت کے مختلف شعبوں میں اصلاح کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں اس لیے عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ہندوؤں کے مذہبی وسماجی حقوق کا جائزہ لیتے وقت خاص طور سے ایسے سلاطین کے زمانہ کو پیش نظر رکھنا اہمیت وافادیت سے خالی نہ ہوگا۔

زیر بحث موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس وقت کی مسلم حکومت کے تحت ہندوؤں کی شرعی حیثیت کیا تھی؟ ان کے ساتھ سلاطین دہلی کا طرز عمل ذمی کی حیثیت سے تھا یا غیر مسلموں کے کسی اور طبقہ (حربی وامانی وغیرہ) کے طور پر؟ اس سوال پر یہاں کچھ تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوتی ہے کہ بعض جدید اسکالرس (مثلاً ایم ٹی ٹائیٹس (M.T. TITUS)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ہندوؤں کے ساتھ مسلم فاتحین وسلاطین کے برتاؤ سے بحث کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے مسلم حکومت کے تحت ذمی کا مقام صرف اہل کتاب کو دیا جا سکتا ہے اور اس زمرہ میں یہود و نصاریٰ، مجوسی وصابئی شامل ہیں۔ باقی بت پرستوں اور مشرکین کے لیے صرف دو ہی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اسلام یا قتل۔ مسلم حکمرانوں نے یہاں کے ہندوؤں کے ساتھ جو رویہ (انھیں ذمی کا مقام دینے کا) اختیار کیا وہ اسلامی قانون کے مطابق نہیں تھا اور ایسا انھوں نے ضرورت یا مصلحت کے تحت کیا۔[1] اس ضمن میں پہلے اسلامی قانون کے اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی نئے علاقہ کی فتح اور وہاں مسلم حکومت کے قیام کے بعد مفتوحین میں جو لوگ اپنے قدیم مذہب پر باقی رہنا چاہتے ہیں اور مسلم حکومت کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ماتحتی و تابعداری قبول کرتے ہیں اور یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ حکومت کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہ کریں گے تو حکومت ایسے غیر مسلموں کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے اور ان کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری لیتی ہے۔ وہ انھیں فوجی خدمت کے لیے مجبور نہیں کر سکتی لیکن وہ اختیار رکھتی ہے کہ ذمیوں سے سالانہ جزیہ کے نام سے ایک محصول وصول کرے۔ یہ محصول صرف ان ذمیوں پر عاید کیا جائے گا جو فوجی خدمت کے قابل ہوں گے۔ عورت، بچے، بوڑھے، معذور نادار اور معابد کے خدام اس سے مستثنیٰ قرار پائیں گے۔[2] فقہاء کے مابین اس امر میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ کون سے غیر مسلم یا کن مذاہب کے ماننے والے ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے ایک قول کے مطابق اہل کتاب (یہود و نصاریٰ اور مجوس (آتش پرست) کے علاوہ مشرکین و کفار کو بھی اہل ذمہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان سے صرف مشرکین عرب مستثنیٰ ہوں گے جن کے لیے قرآن کریم کی صراحت کے مطابق اسلام یا سیف کے علاوہ اور کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔[3] امام مالک کی رائے میں بلا استثنا، عرب و غیر عرب کے مشرکین و کفار کو ذمی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔[4] بعض جدید اسکالرس نے اس رائے کو غلط طور پر امام ابو یوسف سے بھی منسوب کیا ہے۔[5] امام شافعی کے مسلک کے مطابق صرف اہل کتاب اور مجوس کو ذمی کی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔[6] یہاں یہ پیش نظر رہے کہ جن فقہاء کے نزدیک مشرکوں اور بت پرستوں کو بھی ذمی کا درجہ دیا جا سکتا ہے وہ انھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"شبہ اہل کتاب" قرار دیتے ہیں۔ اہل کتاب اور شبہ اہل کتاب کے ذمیوں میں وہ یہ فرق کرتے ہیں کہ موخر الذکر کا ذبیحہ کھانا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہ ہوگا[۸] جبکہ اہل کتاب ذمیوں کے سلسلہ میں یہ چیزیں روا ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ غیر مسلموں کو ذمی بنانے کا مسئلہ فقہاء کے مابین مختلف فیہ رہا ہے اور مذکورہ دانشور نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ صرف شافعی فقہاء کی ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ہندوستان میں سلاطین اور مسلمانوں کی اکثریت حنفی مسلک کی پیرو تھی۔ اس لیے حنفی مسلک ہی اختیار کیا گیا اور سرکاری طور پر بھی یہی معمول رہا۔[۸]

غیر مسلموں کی شرعی حیثیت کے بارے میں مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں جہاں تک ہندوؤں کی حیثیت کا تعلق ہے یہ مسئلہ سب سے پہلے اس وقت زیر بحث آیا جب عظیم فاتح محمد بن قاسم کے زیر قیادت سندھ میں ۷۱۲ء میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی۔ تاریخ سندھ کے ایک مستند ماخذ چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم نے سندھ کے ان مفتوحین (جن میں برہمنی و بودھ دونوں شامل تھے) کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا اور ان پر جزیہ عاید کیا جنھوں نے اپنے قدیم مذہب پر قایم رہتے ہوئے مسلم حکومت کے زیر نگیں رہنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اس حیثیت سے انھیں مذہبی آزادی ملی اور قدیم منادر کی مرمت و آبادکاری کی اجازت دی گئی۔[۹] گرچہ چچ نامہ یا کسی اور ماخذ میں اس کی صراحت نہیں ملتی لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ محمد بن قاسم نے والی عراق اور علماء سے صلاح و مشورہ کے بعد ہی ہندوؤں کے سلسلہ میں یہ فیصلہ لیا ہوگا، جیسا کہ اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ انھیں قدیم معابد کی مرمت کی اجازت دینے اور بعض دوسرے مسائل میں محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے مشورہ اور علماء سے استفسار کیا تھا۔[۱۰] یہاں یہ وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مشہور عرب مورخ بلاذری نے صاف طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ سندھ کی فتح کی مہم کے دوران اور بعد کے زمانہ میں بھی حجاج بن یوسف سے محمد بن قاسم کی مراسلت برابر جاری رہی اور یہ صراحت بھی کی ہے کہ ہر تیسرے روز خطوط کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔[۱۱]

متعدد جدید اسکالرس (اور بعض نے چچ نامہ کا حوالہ دیتے ہوئے) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ محمد بن قاسم کے عہد حکومت میں ہندوؤں کو "مشابہ اہل کتاب" کے زمرہ میں شمار کر کے ذمیوں کے حقوق عطا کیے گئے۔[۱۲] معاصر ماخذ میں ان کو ذمی قرار دئے جانے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ وجہ واضح نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے منادر کے سلسلہ میں محمد بن قاسم کا یہ اعلامیہ صاف طور پر چچ نامہ میں مذکور ہے کہ ان کی وہی حیثیت ہے جو شام و عراق کے یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کی عبادت گاہوں کی ہے[۱۳] اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں "مشبہ اہل کتاب" کے درجہ میں رکھا گیا۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ ہندوستانی علماء میں عہد مغلیہ کے آخری دور کے مشہور عالم، صوفی و شاعر مرزا مظہر جانجاناں (۱۶۹۸ - ۱۷۸۱ء) کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان میں بھی انبیاء و رسل مبعوث ہوئے ہیں اور ہندوؤں میں بید (وید) نام کی ایک آسمانی کتاب ملتی ہے جو برہما فرشتہ کے توسط سے بھیجی گئی تھی[۱۴]۔ مزید براں مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت واضح انداز میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ اگر مجوسی و صابئی "شبہ اہل کتاب" میں شمار کیے جا سکتے ہیں تو ہندو بدرجۂ اولیٰ غیر مسلمین کے اس زمرہ میں شامل کیے جانے کے مستحق ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی رائے ظاہر کی کہ مجوسیوں کے بارے میں یہ عام طور پر معروف ہے کہ ان کے پاس ایک آسمانی کتاب (ژند اوستا) تھی جسے وہ پڑھتے پڑھاتے تھے، یہی بات ہندوؤں کے بارے میں وہ شخص کہہ سکتا ہے جسے ان کے حالات کا گہرا علم ہے[۱۵] کوئی ضروری نہیں کہ ہندوستان میں انبیاء کی بعثت اور ہندوؤں میں آسمانی کتاب کے نزول کے خیال سے کلی طور پر اتفاق کیا جائے یا اسے پوری طرح محقق مانا جائے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں مسلم حکومت کے قیام کے ابتدائی دور میں انہی امکانات کی روشنی میں اس زمانہ کے علماء نے انھیں مشابہ اہل کتاب کے زمرہ میں شامل کیا ہوگا۔

بہر حال سندھ میں عربوں کی حکومت کے دوران ہندوؤں کی جو حیثیت قانونی و عملی طور پر تسلیم کی گئی تھی وہی تیرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں شمالی ہند میں ترکوں کی حکومت (معروف بہ "دہلی سلطنت") کے قیام کے بعد بھی برقرار رہی۔ اس زمانہ کی تاریخی کتب اور دوسرے قسم کے لٹریچر سے یہ واضح ثبوت ملتا ہے کہ سلاطین دہلی نے انھیں ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا اور عملی طور پر بھی ان سے اسی حیثیت میں برتاؤ کیا۔ معاصر مورخین میں ضیاء الدین برنی (مولف تاریخ فیروز شاہی) کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التتمش کے دور (۱۲۱۰ - ۱۲۳۵ء) میں علماء میں اس مسئلہ پر اختلاف رائے پایا جاتا تھا اور بعض علماء اس حق میں نہیں تھے کہ ہندوؤں کو ذمی کا مقام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عطا کیا جائے۔ برنی کے بیان کے مطابق معاصر علماء کے ایک وفد نے سلطان کے دربار میں حاضر ہو کر یہ سفارش کی تھی کہ انھیں ذمی کا درجہ نہ دیا جائے بلکہ ان کے ساتھ "اما الاسلام او القتل" کا معاملہ کیا جائے اس لیے کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں ہیں۔[16] ان علماء کے بارے میں بعض جدید اسکالرس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے وہ شافعی مسلک کے پیروکار رہے ہوں جس کی رو سے اہل کتاب و مجوسیوں کے علاوہ دوسرے غیر مسلموں کو ذمی کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔[17] برنی نے اسی سلطان کے معاصر ایک معروف عالم اور دہلی کے شیخ الاسلام سید نورالدین مبارک غزنوی[18] کے بارے میں یہ ذکر کیا ہے کہ انھوں نے سلطان کے دربار میں ایک وعظ کے دوران یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے اور یہ کہ سلطان تحفظ دین کا فریضہ اس وقت تک انجام ہی نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ کفر و شرک کا استیصال نہ کردے اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہیں تو کم از کم ان کو ذلت و خواری کی حالت میں رکھے۔[19] اسی طرح ضیاء الدین برنی نے سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۵ء۔ ۱۳۱۵ء) اور قاضی مغیث الدین کے مشہور مکالمہ میں قاضی مغیث سے یہ قول منسوب کیا ہے کہ ہندوؤں کو ذلت و خواری میں رکھا جائے اس لیے کہ یہ لوازم دین داری میں سے ہے اور یہ کہ صرف امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہندوؤں سے جزیہ قبول کرنا جائز ہے اور باقی دوسرے ائمہ مذاہب اس کے حق میں نہیں ہیں ان کے مسلک کے رو سے ان کے بارے میں بس یہی حکم ہے اما الاسلام و اما القتل۔[20] برنی کے مذکورہ بیانات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ اس نے ہندوؤں سے متعلق خود اپنے خیال کو دوسروں کی زبان سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے یہاں یہ واضح رہے کہ برنی کے بارے میں جدید مورخین کا عام تاثر یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سیاسی و سماجی تصورات کو تاریخ فیروز شاہی اور دوسری کتابوں میں کہیں کسی سلطان یا امیر کی زبان سے اور کہیں کسی عالم یا سیاسی مفکر کے واسطہ سے پیش کیا ہے۔[21] تاریخ فیروز شاہی اور برنی کی دوسری اہم کتاب فتاوائے جہانداری (جو سیاست و حکومت اور سماج و معاشرت سے متعلق برنی کے افکار و خیالات کی آئینہ دار ہے) کے موازنہ سے اس نوع کی بہت سی مثالیں سامنے آتی ہیں۔[22] ہندوؤں کے سلسلہ میں برنی کا یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رویہ اس وجہ سے اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے ان کے بارے میں عہد التتمش کے کچھ علماء، سید نورالدین مبارک اور قاضی مغیث الدین کا جو موقف بیان کیا ہے اس کے لیے تقریباً ایک ہی انداز اور ملتے جلتے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ہندوؤں کی شرعی حیثیت سے متعلق قاضی مغیث کا جو بیان برنی نے نقل کیا ہے وہ اس وجہ سے بھی محل نظر ہے کہ اس میں ہندوؤں سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور امام اعظم کی رائے کا بھی حوالہ دیا گیا ہے[۲۳] جبکہ خاص ہندوؤں کے بارے میں کوئی حدیث یا امام اعظم کی کوئی بحث نہیں ملتی۔ برنی نے خود اپنا نقطۂ نظر ان لفظوں میں واضح کیا ہے "جزیہ ستدن از ہندو جائز نیست کہ ایشاں راکتابی وپیغمبری نبوده است"[۲۴] (ہندو سے جزیہ لینا جائز نہیں اس لیے کہ ان کے پاس نہ تو کوئی (آسمانی) کتاب ہے اور نہ ان میں کوئی پیغمبر آیا ہے) اوپر بیان کیے گئے برنی کے مخصوص طرز تاریخ نگاری کی روشنی میں یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ اس نے اپنے موقف کو دوسروں کی زبان سے بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح اس نے نسبی ونسلی امتیاز پر مبنی اپنے مخصوص سماجی تصورات کے سلسلہ میں بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے[۲۵]

ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے بارے میں ضیاء الدین برنی یا ان کے ہم نوا بعض معاصر علماء کی جو بھی رائے رہی ہو واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جمہور علماء و فقہاء انھیں ذمی قرار دیے جانے کے حق میں تھے اور مسلم حکمرانوں کے طرز عمل سے بھی اسی کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود ضیاء الدین برنی نے یہ (گرچہ شکایت کے انداز میں) بیان کیا ہے کہ دہلی سلطنت کے تحت ہندوؤں کو ذمی کا مقام ملا ہوا ہے اور یہ جزیہ ادا کرنے کے عوض انھیں اپنے مذہبی رسوم کی بجا آوری کی آزادی اور بہت سی مراعات حاصل ہیں[۲۶]۔ مزید براں برنی نے سلطان علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث کے مشہور مکالمہ میں بھی ہندوؤں پر جزیہ عاید کیے جانے (اور اس طرح ان کے ساتھ ذمیوں کا برتاؤ کرنے) کا ذکر کیا ہے[۲۷]۔ اس شہادت سے مستشرق ریوبن لیوی (Reuben Levy) کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ علاء الدین خلجی نے ہندوؤں پر جزیہ عاید نہیں کیا اس لیے کہ وہ انھیں ذمی کا مرتبہ دینے کے خلاف تھا[۲۸]۔ برنی کے علاوہ عہد سلطنت کے دوسرے متعدد مورخین کے بیانات سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں کو اہل ذمہ کی حیثیت حاصل تھی[۲۹]۔ سرکاری خطوط اور احکام وہدایات کے ایک اہم مجموعہ انشاء ماہرو،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔[۳۰] خود سلطان فیروز شاہ تغلق کا اپنا مرتب کردہ رسالہ فتوحات فیروز شاہی[۳۱] اور اسی زمانہ میں لکھی گئی دو اہم کتب سیرت فیروز شاہی[۳۲] اور فوائد فیروز شاہی[۳۳] میں ہندوؤں کے لیے لفظ ذمی کے استعمال اور اس کے قوانین کے اطلاق کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ عہد فیروز شاہی کے مآخذ میں ہندوؤں سے متعلق جو بیانات ملتے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ اہم اور دلچسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ہندوؤں کے مختلف طبقے پائے جاتے تھے اور ایسا نہیں تھا کہ تمام ہندوؤں کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا بلکہ صرف انھیں لوگوں کو یہ مقام دیا گیا جنھوں نے مسلم حکومت کی ماتحتی قبول کی اور جزیہ کی ادائیگی پر رضامندی ظاہر کی جیسا کہ اسلامی قانون کے اس نکتہ کی وضاحت اس سے پہلے کی جا چکی ہے۔ تاریخ فیروز شاہی (عفیف) فتوحات فیروز شاہی اور سیرت فیروز شاہی تینوں مآخذ میں بعض الفاظ کے فرق کے ساتھ یہ مضمون ملتا ہے کہ ہندوؤں میں سے جو ذمی ہیں یا جنھوں نے اس حیثیت سے رہنا قبول کر لیا ہے انھیں آزادی اور آرام و راحت حاصل ہے باقی جو حربی ہیں[۳۴] ان کے ساتھ جنگ و جدال کا معاملہ ہوتا رہتا ہے۔[۳۵] تاریخ فیروز شاہی کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"واہل کفر از طائفہ ذمیاں و امانیاں زیر سایہ چتر فیروز شاہی از رعیت بادشاہی برخاہیت می گذرایند و اہل دار حرب را ہر سال نہب و تاراج می کردند۔[۳۶]"

اُس وقت کے ہندوستان میں ذمی کے علاوہ دوسری قسم کے لوگوں (حربی) کی موجودگی پر خاص زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے سلسلہ میں حکومت یا مسلمانوں کے برتاؤ سے بحث کرتے ہوئے عام طور پر اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے حربیوں یا باغیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ بھی ذمیوں یا عام ہندوؤں کے ساتھ سمجھا جاتا ہے اور یہ تاثر بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے۔ اس لیے مسلم حکومت کے دوران ہندوؤں کے حقوق یا ان کے ساتھ حکمرانوں کے برتاؤ سے بحث کرتے ہوئے یہ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ تاریخی مآخذ کے حوالہ سے حکومت کے جس طرز عمل کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ ذمیوں سے تعلق رکھتا ہے یا حربیوں اور باغیوں سے اور اصلاً یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہندوؤں میں جو ذمی تھے ان کے ساتھ حکومت اور مسلم عوام کے برتاؤ کی کیا نوعیت رہی ہے۔ اس پر دو پہلو سے غور کیا جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں مرتب کی گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فقہی تالیفات میں اس مسئلہ میں کیا نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذمیوں کے ساتھ سلاطین کے رویہ کو معلوم کیا جائے۔ اس کے لیے تاریخ کے صفحات میں بکھرے ہوئے مواد کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگرچہ دوسرے پہلو سے زیر بحث مسئلہ پر روشنی ڈالنا زیادہ اہم ہوگا لیکن اس باب میں معاصر علماء کے فقہی مباحث کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ قرین قیاس یہی ہے کہ ذمیوں کے حقوق کی وضاحت کرتے ہوئے معاصر علماء نے ہندوؤں کو ضرور پیش نظر رکھا ہوگا۔

عہد فیروز شاہی کی فقہی تالیفات میں فتاوائے فیروز شاہی سب سے زیادہ اہم ہے یہ مجموعہ جو سلطان کی ایما پر مرتب کیا گیا مکمل طور پر استفتاء وفتوی کی صورت میں ہے سوال و جواب کے لیے فارسی زبان کو ترجیح دی گئی ہے البتہ ہر جواب یا فتوی کی تائید میں عربی ماخذ سے عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ اس کے مباحث میں اس زمانہ کے حالات اور مخصوص مسائل کی بھی عکاسی ملتی ہے۔[۳۷] اس زمانہ کی دوسری کتاب جس میں ذمی کے مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ شرف بن محمد العطائی کی مرتب کردہ "فوائد فیروز شاہی" ہے اس میں اس عہد کی تمدنی ومعاشرتی زندگی اور علمی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کا ایک معتد بہ حصہ فقہی مباحث سے تعلق رکھتا ہے جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق شریعت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔[۳۸]

اس عہد کی ایک اور معرکۃ الآراء فقہی تالیف "فتاوائے تاتارخانی" ہے جو فیروز شاہ کے ایک قریبی معتمد اور اہم عہدہ دار تاتارخاں کی ایماء پر مرتب کی گئی تھی متعدد جلدوں پر مشتمل یہ فقہی تالیف مخطوطہ کی صورت میں (علی گڑھ کے علاوہ) بعض لائبریریوں میں محفوظ ہے اس کی ابتدائی جلدیں ہی ابھی شائع ہو پائی ہیں جن میں ذمیوں کے مباحث دستیاب نہیں ہیں۔[۳۹] اس لیے فقہی تالیفات کی روشنی میں ذمیوں کے مذہبی وسماجی حقوق سے بحث کرتے ہوئے خاص طور سے فتاوائے فیروز شاہی کے مباحث ہی پیش نظر رہے ہیں۔

جہاں تک ذمیوں کی مذہبی آزادی کا تعلق ہے اس مجموعہ فتاوی سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ انھیں اپنے مذہبی رسوم ورواج کی بجاآوری اور مندروں میں پوجا پاٹ کی اجازت حاصل تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ براہ راست اس امر سے متعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوال وجواب نہیں ملتا کہ انھیں یہ اجازت حاصل ہوگی کہ نہیں بلکہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ کوئی ذمی اگر بت خانہ کا راستہ بھول جائے تو اس کی رہنمائی کرنی چاہیے کہ نہیں یا اگر کوئی بوڑھا ذمی گھر سے مندر یا مندر سے گھر پہونچنے کے لیے اپنے مسلم لڑکے کی مدد چاہتا ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے کہ نہیں[40]۔ فتاویٰ کے علاوہ فوائد فیروز شاہی میں بھی اس مسئلہ سے بحث کی گئی ہے[41] ذمیوں کی مذہبی آزادی کے بارے میں شریعت کے موقف کے واضح ہونے کی وجہ سے غالباً اس سے متعلق سوال نہیں پیدا ہوا بلکہ اس کے بارے میں وہ فروعی سوالات سامنے آئے جو بعض مخصوص حالات میں کسی گھر یا خاندان میں پیدا ہو رہے تھے، عبادت گاہوں یا مندروں کی تعمیر کے مسئلہ پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے خاص شہروں میں ذمیوں کو نئے منادر کی تعمیر کی اجازت نہ ہوگی البتہ اگر ایسا مقام یا علاقہ ہے جہاں اسلامی شعائر (جمعہ، عیدین وحدود) کا قیام عمل میں نہیں آرہا ہے تو وہاں انھیں نئے منادر تعمیر کرنے کی ممانعت نہ ہوگی اور جہاں تک قدیم معابد کی مرمت کا سوال ہے وہ ہر جگہ اس کے مجاز ہوں گے[42]

فتاویٰ میں ذمیوں سے متعلق متعدد سوالات کے جوابات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انھیں نہ صرف یہ کہ معاشرتی حقوق حاصل تھے بلکہ انھیں سماجی تحفظ بھی ملا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ملکیت، اس کے استعمال وانتقال اور شفعہ کے باب میں انھیں وہی وہی حقوق حاصل تھے جن سے مسلم فائدہ اٹھا رہے تھے[43] فتاویٰ نے ان کی جان کو بھی قابل احترام اور ان کے ناحق ضیاع کو موجب سزا ٹھہرایا ہے[44] فتاویٰ کی رو سے حکومت یا کسی مسلم شہری کے لیے یہ جائز نہیں کہ ان کی املاک وجائداد کو نقصان پہونچا یا انھیں تلف کرے۔ ان کے اموال کے تحفظ پر جو خاص زور ملتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ذمیوں کی ان چیزوں کو نقصان پہونچانا یا تلف کرنا بھی جائز نہیں جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے حرام ہیں اور جنھیں مسلمانوں کے شہروں میں لانا ممنوع ہے (مثلاً شراب وخنزیر وغیرہ) اس لیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے حرام ہونے کی وجہ سے ذمیوں کے لیے ان کی جو حیثیت (مال ہونے کی) ہے اس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ اور بات ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے ایسے ذمی موجب سزا قرار پائیں گے[45] ان سب سے بڑھ کر ان کے معاشرتی حقوق کی نوعیت کا صحیح اندازہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے جان و مال کو نہ صرف یہ کہ قانونی تحفظ حاصل تھا بلکہ اپنی جان و مال پر کسی کی جانب سے دست درازی کی صورت میں وہ اسی طرح عدالت سے چارہ جوئی کے مجاز تھے جس طرح مسلمانوں کو یہ حق حاصل تھا۔[۲۶]

ذمی کی حیثیت سے ہندوؤں کے مذہبی و سماجی حقوق سے متعلق فقہی تالیفات کی ان تصریحات کے ساتھ تاریخی ماخذ سے بھی یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ فاتح سندھ اور ہند کے اولین مسلم حکمراں کے زمانہ سے ہندوؤں کو جو مذہبی آزادی اور معاشرتی حقوق حاصل تھے وہ بدستور باقی رہے اور ان میں کوئی فرق نہیں آیا، خود فیروز شاہ کے زمانہ میں دہلی میں جو صورت حال تھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے معاصر مورخ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں

"اکثر بادشاہان اسلام با چندیں قوت و شوکت مسلمانی کہ در جہاں پیدا آمدہ است ...... روا دارند کہ در دارالملک ایشاں و شہرہائے مسلمانان شعار کفر و کافری ظاہر گردانند و بتاں را آشکارا پرستند و احکام دین باطل خود در میاں بے خوف و ہراس جاری دارند و بت خانہا بدارند...... و بداں چند تنکہ از وجہ جزیہ تمامی شرائط کفر و کافری را معمول دارند و ہمہ ایشاں کتب دین باطل را سبق گویند و احکام آں منتشر گردانند دین حق برادیان دیگر چگونہ غلبہ کند"[۲۷]

گرچہ برنی غیر مسلموں کے تئیں اپنے مخصوص تصورات کی وجہ سے مذکورہ صورتحال کو شکایت کے انداز میں پیش کیا ہے لیکن اس سے بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو مذہبی رسوم و رواج کی بجا آوری کی پوری آزادی حاصل تھی دوسری جانب اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سلطان فیروز شاہ نے برنی کے اس رد عمل کو قبول کرتے ہوئے ان کی مذہبی تقریبات یا پوجا پاٹ کے خلاف کوئی اقدام کیا ہو۔

ان حقائق کے باوجود بعض جدید مورخین نے سلطان کو اس کے لیے مورد الزام ٹھہرایا ہے کہ اس کے عہد میں علانیہ پوجا پاٹ کی اجازت نہ تھی اور ایسا کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور اس کے ثبوت میں دہلی کے ایک برہمن کا قصہ نقل کیا ہے کہ اسے پوجا پاٹ پر اصرار کی وجہ سے سزائے موت دی گئی[۲۸] لیکن تاریخی ماخذ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض مذہبی رسوم کی انجام دہی یا پوجا پاٹ کا ایک عام معاملہ نہیں تھا بلکہ مذہبی آزادی کے نام پر ارتداد پھیلانے والے ایک برہمن کا قضیہ تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس نے دہلی کے قدیم حصہ میں الحاد و بے دینی کی تعلیم و تبلیغ کا ایک اڈہ قائم کر رکھا تھا اور لوگوں کو جمع کر کے شرک و بت پرستی کی دعوت اور کافرانہ اعمال کی ترغیب دیتا تھا یہاں تک کہ اس نے ایک مسلمان عورت کو مرتد بنا دیا تھا۔ اس طرح ارتداد جیسے خطرناک فتنہ کے سدباب کے لیے سلطان نے علماءِ وقت کے مشورہ سے اس برہمن کے خلاف سخت اقدام کیا۔[۹۹]

ہندوؤں کی مذہبی آزادی پر حدبندی کی ایک دوسری مثال یہ بیان کی جاتی ہے کہ سلطان نے ان کے مذہبی میلوں پر پابندی عاید کی اور وہاں آنے جانے کی روک تھام کی۔[۱۰۰] اس معاملہ میں بھی بعض مخصوص حالات میں کچھ پابندیوں اور حکومت کے اقدام کو اس کی عام پالیسی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تاریخی کتب سے جو شہادت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ سلطان نے سماجی اصلاح اور اخلاقی خرابیوں کو دور کرنے کے نقطۂ نظر سے جس طرح مزارات پر عرس وغیرہ کے خاص مواقع پر مسلم عورتوں کی حاضری کو ممنوع قرار دیا تھا اس طرح خاص ازدحام کے مواقع پر مندر میں ہندو عورتوں کی حاضری پر بھی پابندی لگا دی تھی[۱۰۱] اس لیے کہ ان مواقع پر مرد و زن کے کثیر اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ بدخصال اور اوباش قسم کے لوگ بھی محض سیر و تفریح کے لیے وہاں جمع ہو جاتے تھے اور اس کی وجہ سے مختلف قسم کی مذموم حرکتیں اور اخلاقی برائیاں ظہور پانے لگی تھیں۔ دوسرا واقعہ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ دہلی کے نواح میں ملوہ گاؤں میں ایک کنڈ (حوض) تھا جہاں ایک مندر بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ ہندوؤں کی ایک جماعت وہاں بعض مقررہ دنوں میں اپنے پیرو کاروں کے ساتھ گھوڑوں اور ہتھیار کے ساتھ جمع ہوتے۔ اس موقع پر عورتیں اور بچے بھی ہزاروں کی تعداد میں وہاں اکٹھے ہوتے اور بت پرستی ہوتی۔ اس موقع پر دکانیں بھی لگتیں جس کی وجہ سے میلہ کا سا ماحول قائم ہو جاتا۔ نوبت یہاں تک پہنچتی کہ بددین مسلمانوں کا ایک گروہ بھی ہوائے نفس کی اتباع میں اس میلہ میں شریک ہونے لگا۔ سلطان کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے عزم کیا کہ اس فساد کو رفع کرنے اور اسلام و اہلِ اسلام کو اس کے نقصانات سے بچانے کے لیے اقدام کیا جائے۔ چنانچہ اس نے خود موقع پر جا کر صورت حال کا جائزہ لیا اور ہندوؤں میں سے جو ان سرگرمیوں میں پیش پیش تھے اور لوگوں میں گمراہی پھیلا رہے تھے انھیں قتل کرا دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ باقی لوگوں کو تکلیف دہ سزائیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ دی جائیں۔ یہ ساری تفصیلات سلطان نے اپنے رسالہ فتوحات فیروز شاہی میں ذکر کی ہیں۔[۵۳] اور ان سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ ملوہ کے واقعہ کے سرغنہ لوگوں کے خلاف سلطان نے جو سخت قدم رکھا یا وہ ان کے مذہبی رسوم ادا کرنے اور اس کے لیے میلہ منعقد کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ کھلے عام بد دینی اور گمراہی پھیلانے کی وجہ سے تھا اسی لیے سلطان نے وہاں کے عام ہندوؤں کو سزا نہ دینے کی ہدایت کی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک جدید مورخ (کنھیالال سریواستوا) نے سلطان کی اس ہدایت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس کے افسران ہندوؤں کو سزا دینے میں غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے اسی لیے اس طرح کی ہدایت کی ضرورت پیش آئی۔[۵۳]

مسلم حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی و زیادتی کے ثبوت میں اسلام کے قانون جزیہ کو بھی پیش کیا جاتا ہے اور اسے ان پر ایک زائد مالی بوجھ اور ذلت کی نشانی تصور کیا جاتا ہے[۵۴] حالانکہ اگر اسلام کے قانون جزیہ کا صحیح منہاج میں مطالعہ کیا جائے تو کوئی بھی غیر جانبدار اس نتیجہ پر پہونچے بغیر نہ رہے گا کہ یہ ذلت کی نشانی نہیں بلکہ معاشرہ میں عزت و وقعت کا مقام ملنے کی علامت ہے۔ یہ "جاں بخشی کی قیمت" نہیں بلکہ سماجی تحفظ کی گارنٹی ہے اور یہ مسلم حکومت کی جانب سے غیر مسلموں پر لادا جانے والا بھاری بوجھ نہیں بلکہ انھیں فوجی خدمت سے مستثنیٰ رکھنے کا معاوضہ ہے جو انھیں جانی و مالی تحفظ فراہم کرنے کے اہتمام اور دوسرے بھلائی کے کاموں پر خرچ کیا جاتا ہے۔[۵۵] اس محصول کے معمولی اور ہلکا ہونے کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ سال میں صرف ایک بار محض ان لوگوں پر عاید کیا جاتا ہے جو فوجی خدمت کے لائق ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اس محصول کی نوعیت اور اس کی اصل غرض و غایت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو بھی اس کے لیے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اسے اس دور میں ہندوؤں کے ساتھ نارو ا اور سخت سلوک کی ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ فیروز شاہ کی ہندوؤں پر مزید زیادتی و سختی کا ایک مظہر یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے زبردستی برہمنوں پر بھی یہ محصول نافذ کیا حالانکہ اس سے قبل وہ اس سے مستثنیٰ تھے۔[۵۶] معاصر تاریخوں میں سلطان کے اس اقدام کا پس منظر یہ ملتا ہے کہ اسلامی قانون کی روشنی میں جہاں اس نے نظم محاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دوسرے شعبوں میں اصلاح کی طرف توجہ کی وہیں جزیہ کو بھی اس قانون کے مطابق نافذ کرنے کی کوشش کی۔[۵۷] سلطان نے اس مسئلہ پر غور وفکر کے لیے علماء ومشائخ کی میٹنگ طلب کی اور ان کی رائے معلوم کی کہ کیا برہمن اس سے مستثنیٰ قرار دیے جا سکتے ہیں کہ نہیں؟ حاضرین مجلس نے بحث ومباحثہ کے بعد متفقہ طور پر یہ رائے پیش کی کہ برہمن کو جزیہ سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی شرعی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔[۵۸] اس لیے ان پر جزیہ عائد ہونا چاہیے۔[۵۹] اسی فیصلہ کی روشنی میں سلطان نے ان پر جزیہ نافذ کیا، البتہ دہلی کے ہندوؤں کے اس کے خلاف احتجاج کی وجہ سے برہمنوں پر فی نفر دس ٹنکہ مقرر کیا جو اس وقت جزیہ کی سب سے کم مقدار تھی اور آمدنی کے اعتبار سے سب سے نچلے طبقہ کے لوگوں پر عائد کی جاتی تھی یہ یقیناً برہمنوں کے ساتھ سلطان کی خصوصی رعایت تھی جس کا اعتراف عہد جدید کے بعض ہندو مورخین کے یہاں بھی ملتا ہے۔[۶۰]

تاریخی مآخذ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی کہ سلطان فیروز شاہ سے قبل کس دور میں برہمنوں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ Indian Islam. کے مصنف ایم ٹی ٹائیٹس نے چچ نامہ کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فاتح سندھ محمد بن قاسم کے کے عہد حکومت ہی میں انھیں اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا اور اس کی وجہ مصنف نے اسی ماخذ کے حوالہ سے یہ بیان کی ہے کہ انھیں جزیہ کا محصل مقرر کیا گیا تھا۔[۶۱] لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ چچ نامہ میں واضح طور پر برہمنوں پر جزیہ عاید کیے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں صاف لکھا ہوا ہے کہ ان میں سے جو لوگ اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے اور ایمان نہ لائے انھیں معاشی حالت کے اعتبار سے تین طبقوں (امیر، متوسط وادنیٰ) میں تقسیم کرتے ہوئے ان پر بالترتیب ۴۸، ۲۴ و ۱۲ درہم جزیہ مقرر کیا گیا ان کی جان ومال کو تحفظ فراہم کیا گیا اور ان کی زمین وجائداد اور گھوڑے ان کے قبضہ میں چھوڑ دیے گئے (وآنچہ ایمان نیاوردند مال (جزیہ) بر ایشاں مقرر گشت بر سہ فوج، اول فوج مہین را از ہر یک چہل وہشت درم سنگ نقرہ وفوج دیگر را بیست وچہار درم سنگ وفوج اسفل را دوازدہ درم سنگ قرار دادند..... وبرکیش اسلاف می رفتند وضیاع واسپان از ایشاں تحویل نشد۔[۶۲] اہم بات یہ کہ سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ محمد بن قاسم کا یہی طرز عمل بعد کے حکمرانوں کے لیے بھی نمونہ ثابت ہوا۔ دوسرے یہ کہ برہمنوں میں سے جو سربرآوردہ وباثر تھے انھیں خراج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دوسرے محاصل کی وصولی کے لیے مقرر کیے جانے کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن یہ کہیں وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ ایسے لوگوں کو جزیہ سے بری کر دیا گیا تھا "پس دہقانان و رئیسان را بر تحصیل مال معاملہ نصب فرمود تا از شہر و روستا اموال در ضبط آرند ایشاں را قوتی و استظہاری باشد... و بجہتہ برہمناں کہ امیر محمد قاسم ایشاں را بر سر مال نصب کردہ بود و گفت: راستی میاں خلق و سلطان نگاہ دارید و بقدر احتمال ہر کس را خراج نہید"[۶۳] یہاں یہ وضاحت بے موقع نہ ہوگی کہ محمد بن قاسم ہی نہیں بلکہ بعد کے دوسرے حکمرانوں کے زمانہ میں بھی یہ معمول رہا ہے کہ حکومت کسانوں سے خراج کی تحصیل میں ہندوؤں کے ایسے طبقہ کی مدد لیتی تھی جو مقامی طور پر معزز و با اثر ہوتے تھے اور انھیں اس خدمت کے عوض مختلف قسم کی مراعات ملتی تھیں[۶۴]۔ بہر حال ان تفصیلات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس بات کی کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی کہ خراج یا جزیہ کی تحصیل کے لیے برہمنوں کو مقرر کرنے کی وجہ سے انھیں جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس کے بجائے یہ امکان زیادہ قوی نظر آ رہا ہے کہ معابد کی خدمت یا دوسری مذہبی خدمات میں مصروف رہنے کی بنیاد پر فیروز شاہ سے قبل کسی زمانہ میں ان کو اس سے بری کیا گیا ہو، بہر حال استثنا کی مذکورہ بالا توجیہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ معاصر مآخذ کا حوالہ دے کر کس طرح ان کی عبارت کی غلط ترجمانی کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کو جس امر کے لیے سب سے زیادہ بدنام اور مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے و۔ در کا انہدام ہے۔ اس سے متعلق واقعات کو بیان کرنے میں جس مبالغہ آرائی۔ نام لیا جاتا ہے اور اس طویل عرصہ حکومت سے متعلق خاص اسی مسئلہ کو اچھالنے کی جو مہم جاری ہے وہ یا اس کی غرض و غایت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ کچھ معاصر مورخین کے مبالغہ آمیز اور غیر محتاط بیانات کی وجہ سے جو غلط تاثرات ابھرتے ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بعد کے دور میں برطانوی مورخین اور خود ہندوستانی مورخین و اہل قلم کے ایک طبقے نے اس زمانہ کے مزاج یا درباری مورخین کے انداز تحریر کو نہ سمجھتے ہوئے یا سمجھ کر دانستہ طور پر اس باب میں مسلم حکومت کے طرز عمل کی جو غلط ترجمانی کی ہے یا اس سے متعلق واقعات کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے وہ نہ صرف علمی بد دیانتی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی بد ترین مثالیں ہیں بلکہ ملک میں سماجی تعلقات اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی بہت خطرناک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسے مورخین کے بیانات سے یہی تاثر ملتا ہے کہ مسلم حکمرانوں کی سیاسی و انتظامی پالیسی میں منادر کی مسماری کو اوّلیت حاصل تھی بلکہ ان بیانات کو پڑھ کر اگر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرے تو غلط نہ ہوگا کہ یہی اُس زمانہ کی حکومت کا ایک نکاتی پروگرام تھا۔ اس نقطۂ نظر کا ہلکا سا اندازہ ایم اے ٹائیٹس کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ میں مندروں کے انہدام کا جو منصوبہ بند پروگرام شروع کیا تھا وہ عہد عالمگیری تک جاری رہا۔[۶۵] اس ضمن میں جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا دینی رجحان رکھنے والے حکمرانوں کو زیادہ پرجوش وسرگرم دکھایا جاتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے بارے میں ایک جدید مورخ نے لکھا ہے کہ وہ منادر کی مسماری اور ہندوؤں کے قتل میں فخر محسوس کرتا تھا اور یہ کہ فیروز شاہ اور ان کے پیش رو سلطان جہاں کہیں بھی کوئی مندر دیکھتے تھے اس کی بے حرمتی کرتے تھے۔[۶۶]

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سلطان فیروز شاہ کے عہد حکومت میں کچھ مندر مسمار کیے گئے لیکن یہ کہنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا کہ یہ سب واقعات ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت رونما ہوئے اور اُن سب کا محرک بس ایک ہی تھا۔ معاصر تاریخوں میں اس سے متعلق مذکورہ واقعات کے تجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ منادر مختلف عوامل کے تحت منہدم کیے گئے۔ بعض جنگ کے دوران منہدم ہوئے، بعض کو اس لیے مسمار کیا گیا کہ وہ نئے تھے جو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے شہروں میں (دہلی اور اس کے نواح میں) بنائے گئے تھے اور بعض بداخلاقی و منکرات کا اڈا بن گئے تھے۔ اس لیے انھیں ختم کرنا ضروری سمجھا گیا۔[۶۷] کچھ سنجیدہ و حقیقت پسند ہندو مورخین نے تاریخی واقعات و شواہد کی روشنی میں عہد فیروز شاہ میں انہدام منادر سے متعلق جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے "ہسٹری آف فیروز شاہ تغلق" کے مصنف جے ایم بنرجی لکھتے ہیں:

> It is related that the destruction of the temple of Jágannath was the outcome of Sultan's fanaticism. But one should not forget that the temple was destroyed as an act of war under some special circumstances, in course of sultan's raid on Taj Nagar. It had nothing to do with his

۱۴۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

intolerance.[۶۸]

مزید براں دہلی اور اس کے نواح میں چند مندروں کے انہدام کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ اس کے وجوہ بیان کرتے ہیں:-

But they were destroyed firstly because of their construction without state permission and secondly because their being the centre of Public Corruption during the festivals when men & women both Hindus and Muslims used to assemble there in large number and indulge in immoral acts. It was infact, a measure for purging out the unclear atmosphere. From these few instances it should not be inferred that the sultan followed a policy of temple destruction so as be charged as a fanatic.[۶۹]

اسی طرح ایک دوسرے اسکالر ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے بھی اس مسئلہ پر حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے۔ خود انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو: "فیروز شاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسری طرف پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروز شاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر نہیں توڑے"[۷۰]

ایک دوسرے معروف مورخ پروفیسر ریاض الاسلام بھی اس رائے سے کلی اتفاق کرتے ہیں کہ عہد فیروز شاہی میں مختلف وجوہ سے کچھ منادر مسمار کیے گئے اور انھوں نے واضح طور پر یہ خیال پیش کیا ہے کہ سلطان فیروز شاہ نے قدیم منادر کے تقدس کو برقرار رکھا۔ مزید براں سیرت فیروز شاہی کے حوالے سے انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ نگر کوٹ میں جوالا مکھی مندر اسی اصول کے تحت باقی رکھا گیا۔[۷۱] اس طرح منادر کے انہدام سے متعلق واقعات کو ان کے صحیح سیاق وسباق میں دیکھا جائے اور ان کے اسباب وعوامل پر باریکی سے غور کیا جائے تو یہ خیال پوری طرح غلط ثابت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگا کہ فیروزشاہ یا دوسرے مسلم حکمرانوں کا یہی خاص مشن تھا یا انھوں نے منصوبہ بند طور پر یہ کام انجام دیا مزید براں تاریخی واقعات کو صحیح سیاق و سباق میں نہ دیکھنے کے علاوہ اس باب میں غلط فہمی پیدا کرنے کے کچھ دوسرے وجوہ بھی ہیں، اس مسئلہ سے متعلق قانونی باریکیوں سے عدم واقفیت بھی بعض اوقات غلط رائے پر منتج ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ فیروزشاہ کے زمانہ میں نئے منادر کے خلاف اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جدید اسکالر نے لکھا ہے کہ سلطان اس درجہ مذہبی متشدد تھا کہ اس نے ہندوؤں کو جزیہ کی ادائیگی کے بعد بھی نئے منادر کی تعمیر کی اجازت نہ دی[۵۹] حقیقت یہ ہے کہ اس اجازت کا تعلق جزیہ کی ادائیگی سے نہیں بلکہ ذمیوں سے متعلق اسلامی قانون کی اس شق سے ہے کہ انھیں مسلمانوں کے شہروں میں نئے منادر کی تعمیر کی اجازت نہ ہوگی گرچہ وہ اپنی پرانی عبادت گاہوں کے مرمت کے مجاز ہوں گے۔ جیسا کہ اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے۔ مزید دلچسپ بات یہ کہ اس باب میں محمد بن قاسم سے فیروزشاہ کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ مقدم الذکر زیادہ روادار تھے اس لیے کہ ان کی حکومت کے تحت سندھ میں ہندوؤں کو منہدم شدہ مندر کی دوبارہ تعمیر کی اجازت دی گئی[۶۰]۔ اول تو یہ موازنہ ہی غلط ہے اس لیے کہ نئے مندر کی تعمیر اور منہدم مندر کی دوبارہ تعمیر دو الگ الگ نوعیت کے مسائل ہیں ایک کا دوسرے پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔ دوسرے چچ نامہ کے حوالہ سے جس واقعہ کو بطور ثبوت پیش کیا گیا ہے وہ کسی منہدم مندر کی دوبارہ تعمیر سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ پرانی وغیر آباد مندر کی مرمت یا ازسر نو تعمیر سے متعلق ہے[۶۱] ان سب کے علاوہ عربی یا فارسی ماخذ کے غلط ترجمے بھی زیر بحث مسئلہ میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک برطانوی دانشور نے فتوحات فیروزشاہی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ سلطان فیروزشاہ نے نئے منادر کی تعمیر کے ذمہ داروں اور سرغنہ لوگوں کو جو دوسروں کو گمراہ بھی کرتے تھے قتل کرا دیا باقی ان کے عام پیروکاروں کو کوڑوں کی سزا دے کر اس طرح کی حرکتوں سے باز رکھا[۶۲] اور حقیقت یہ ہے کہ فتوحات کے متعلقہ حصہ میں صرف تعزیر یا عام سزا کا ذکر آیا ہے۔ اس میں کوڑے کے لیے کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے، اس کی اصل عبارت ملاحظہ ہو" وائمۂ کفر کہ دیگراں را اضلال کردند بکشتیم وعوام ایشاں را بہ تعزیرات زجر کردیم تا ایں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فساد بہ کلی افتاد"۔[۴۶]

ایک اور اہم معاملہ جسے ہندوؤں کے ساتھ سلطان فیروز شاہ کے متعصبانہ برتاؤ اور امتیازی رویہ کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ حکومت کی انتظامیہ سے ہندوؤں کو علٰحدہ رکھنا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عہد فیروز شاہی میں اہم مناصب پر ہندوؤں کی تقرری کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ سلطان نے ان کو انتظامیہ سے پوری طرح علٰحدہ رکھا یا اس باب میں کوئی ایسا طرز عمل اختیار کیا جو ان کے پیشروؤں سے یکسر مختلف تھا جیسا کہ بعض جدید مورخین کا خیال ہے۔[۴۷] اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ترک سلاطین کے یہاں نسلی و خاندانی برتری کے تصورات پائے جاتے تھے اور خاص طور سے دہلی سلطنت کے ابتدائی دور میں حکومت کے مزاج پر یہ تصور کافی اثر انداز رہا یہاں تک کہ اس وقت انتظامیہ کے اہم عہدوں پر تقرری میں ہند نژاد مسلمانوں کے مقابلہ میں ترک نژاد اشخاص کو ترجیح دی جاتی تھی اس لیے اس معاملہ میں ہندوؤں کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا گیا اسے اس صورت حال (نسلی و نسبی رجحانات کی دخل اندازی) کی روشنی میں بھی دیکھنا چاہیے۔[۴۸] اس کے باوجود ایسے شواہد کی کمی نہیں کہ جن سے عہد فیروز شاہی میں حکومت کی انتظامیہ میں ہندوؤں کی شمولیت واضح ہے۔ مورخین کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محکمہ مالیات بالخصوص محاصل کے شعبہ میں ان کی تقرری بدستور جاری رہی۔[۴۹] خراج اور دوسرے محاصل کی تشخیص و تحصیل میں ہندو سرداروں اور مقامی روؤسا (جنھیں اس وقت مقدم، چودھری و خوط کہا جاتا تھا) کا جو عمل دخل پہلے سے پایا جاتا تھا اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ مزید براں خراج (محصول آراضی) کے باب میں وہ کسان اور حکومت کے مابین واسطہ Intermediary کی جو حیثیت رکھتے تھے وہ بھی قائم رہی۔[۵۰] اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اسکالرس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ محکمہ مالیات میں ہندو عملہ کی مدد کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا اس لیے اس شعبہ میں ان کی تقرری کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس سے انھوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ تقرریاں رواداری کے تقاضے سے نہیں بلکہ ضرورت کے تحت عمل میں آتی تھیں۔[۵۱] دوسری جانب معاصر مورخ برنی کے بیان سے یہ شہادت ملتی ہے کہ اس عہد میں کفار و مشرکین جنھیں ذمی و خراجی کی حیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل ہے مختلف عہدوں پر مقرر کیا جاتا تھا۔[۹۲] یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ خود سلطان فیروز شاہ کے محافظتی دستہ میں راجپوت شامل تھے اور اس دستہ کا سربراہ بھی ایک ہندو رائے بھیرو بھٹی تھا۔[۹۳] ایک دوسرے مورخ عفیف کے بیان کے مطابق اُس عہد میں شاہی ٹکسال کا افسر اعلیٰ (داروغہ) ایک ہندو (کجر شاہ) تھا۔[۹۴] اسی زمانہ میں اچھ (سندھ) میں ایک ہندو پولیس آفیسر کی تقرری کا بھی ثبوت ملتا ہے۔[۹۵] معاصر و غیر معاصر مورخین سبھی یہ بیان کرتے ہیں کہ "رایان و رانگان" سے سلطان کے تعلقات بہت اچھے تھے ان کو اعزاز و اکرام دینے کے علاوہ سلطان ان سے حکومت کے کاموں میں تعاون بھی لیتا تھا۔[۹۶] مزید براں بہار شریف میں دریافت شدہ ایک کتبہ (جو ۱۳۶۰ — ۱۳۶۵ء سے تعلق رکھتا ہے) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "حاجب ہندوان ممالک" کے نام سے ایک عہدہ ہوتا تھا اور قرین قیاس یہی ہے کہ یہ حدود سلطنت کے ہندوؤں کے معاملات کا نگراں و ذمہ دار ہوتا تھا اور اس پر کسی ہندو کا تقرر ہوتا رہا ہوگا۔[۹۷] اِن واقعات سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہد فیروز شاہی میں بھی ہندو حکومت کے نظم و نسق میں شریک کیے جاتے تھے اور دوسرے ادوار کی طرح اس دور میں بھی انھیں حکومت کی ذمہ داریاں انجام دینے کے مواقع ملتے رہے۔

اوپر کے مباحث سے یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ مسلم حکمرانوں کے برتاؤ سے متعلق متعدد قسم کے غلط تاثرات پائے جاتے ہیں اور ان کے مختلف وجوہ ہیں۔ مذکورہ اسباب کے علاوہ اس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی بھی سلطان کے طرز عمل سے بحث کرتے ہوئے اس کے ذہنی رجحان، اس کی عام پالیسی اور حکومت کے مزاج کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا اور غیر مسلموں کے سلسلہ میں اس کے رویہ کو اس کے عام اصول سیاست اور انداز حکومت سے الگ کرکے دیکھا جاتا ہے۔ درحقیقت فیروز شاہ یا کسی اور سلطان کے زمانہ میں ہندوؤں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے مذہبی و سیاسی رجحانات کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے اور اس کی حکومت کے طور وطریق کو بخوبی سمجھا جائے اور ان سب سے اہم یہ کہ غیر مسلموں سے متعلق اس کے اقدامات پر ان کے اصل سیاق و سباق میں غور کیا جائے اور ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں سے ہر ایک کے اسباب وعوامل کا معروضی انداز میں پتہ لگایا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے سلسلہ میں سلطان فیروز شاہ نے جو کچھ اقدامات کیے اگر ان کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ پیش نظر رکھا جائے کہ اس کی حکومت کی عام پالیسی شرعی قوانین کی روشنی میں حکومت کے نظم ونسق میں اصلاح، لوگوں کی اخلاقی وسماجی زندگی کی درستگی اور عوام کی فلاح وبہبود تھی اور اگر یہ نکتہ بھی سامنے رہے کہ اسی پالیسی کے تحت اس نے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے متعدد اقدامات کیے کہ ان سے مسلمانوں پر کوئی پابندی عائد ہو رہی ہے یا غیر مسلموں پر تو یہ تاثر نہیں پیدا ہوگا کہ اس نے ہندوؤں کے ساتھ سختی وناانصافی کی اور نہ یہ خیال ہی ابھرے گا کہ شریعت کے قوانین کے نفاذ کا مطلب غیر مسلموں کے حقوق کی نفی اور ان پر بے جا پابندی ہے[۹۵]۔ مثال کے طور پر سلطان کی جانب سے مندروں میں خاص ازدحام کے موقع پر عورتوں کی حاضری کی ممانعت کو اس سیاق میں دیکھنا چاہیے کہ اس نے مختلف مزاروں پر عرس کے موقع پر مسلم عورتوں کی زیارت پر بھی پابندی عائد کی اور ان پابندیوں سے اس کا مقصود ان اخلاقی برائیوں کا سد باب تھا جو ایسے مواقع پر مرد وزن کے اختلاط اور کچھ اوباش وبد طینت لوگوں کی حاضری سے جنم پا رہی تھیں۔ اسی طرح یہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ سلطان نے ان ہندوؤں کے خلاف سخت اقدام کیا جو کھلے عام گمرہی وضلالت پھیلا رہے تھے یہاں تک کہ فتنۂ ارتداد کو ہوا دینے لگے تھے۔ اسے اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ ان فرقوں اور تحریکوں کے رہنماؤں واہم ارکان کو سخت سے سخت سزا دینے میں کسی نرمی سے کام نہیں لیا جو اپنے گمراہ کن نظریات وافکار کی اشاعت اور غیر اخلاقی حرکات وسکنات کے ذریعہ ذہنی بے راہ روی اور فکری کجروی پیدا کر رہے تھے ان میں اباحتی وملاحدہ فرقہ کے لوگ بھی شامل تھے اور بعض نام نہاد صوفیا بھی[۹۶]۔ یہ بات بھی معروف ہے کہ سلطان نے قانونِ شریعت اور نظام محاصل میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی ضمن میں اس نے متعدد غیر شرعی محاصل کو ممنوع قرار دینے کے ساتھ مالِ غنیمت کی تقسیم اور خراج کی تشخیص وتحصیل کے نظام میں اصلاح کی۔ اس نقطۂ نظر سے جزیہ کے نفاذ یا برہمنوں کی اِستثنائی حیثیت کے خاتمہ کو دیکھا جائے تو اس اقدام کی بھی اصل نوعیت اور غرض وغایت واضح ہو جائے گی، مزید براں مندروں کے سلسلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیں سلطان کا جو کچھ طرزِ عمل رہا ان سے متعلق واقعات کی تفصیلات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس اقدام کے پیچھے بھی ذمیوں سے متعلق اسلامی قانون کی بعض دفعات کی تعمیل یا اخلاقی و سماجی خرابیوں کو دور کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔

اس سے آگے بڑھ کر اگر سلطان کے ان اقدامات کا مزید گہرا تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ شریعت کی روشنی میں اس نے جو کچھ انتظامی تبدیلیاں یا اصلاحات کیں ان سے عوام کو کافی فائدہ پہونچا اور یہ تاثر بھی غلط ثابت ہوگا کہ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مطلب لوگوں بالخصوص غیر مسلموں کی زندگی کو سخت بنانا یا انھیں زحمت میں مبتلا کرنا ہے۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ سلطان نے قانونِ شریعت کی روشنی میں نظم محاصل کو از سر نو مرتب کیا۔ محصول آراضی کی تشخیص و تحصیل میں اس پر خاص زور دیا کہ اصل پیداوار اور کسانوں کی مالی حالت کا ضرور خیال رکھا جائے۔[90] مزید براں سلطان نے اسی ضمن میں شریعت کے متعینہ محاصل کے علاوہ باقی تمام محاصل کو ممنوع قرار دیا۔ معاصر مورخین کے بیان کے مطابق اس طرح ۲۵ محاصل کی وصولی موقوف ہوگئی جو عرصہ دراز سے رسمی طور پر دیہات و قصبات کے لوگوں پر عاید کیے جاتے تھے۔[91] اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ سلطان کے اس اقدام سے خاص طور سے کسانوں دستکاروں اور مختلف پیشہ والوں کو راحت ملی جن کی اکثریت اس وقت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔[92] اسی طرح اس امر کو بہت شہرت دی جاتی ہے کہ علماء کے مشورہ سے سلطان نے جزیہ کے باب میں برہمنوں کی استثنائی حیثیت کو ختم کر دیا لیکن اس اقدام کا یہ پہلو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس نے ان کے ساتھ خصوصی رعایت کرتے ہوئے ان پر یکساں طور پر فی نفر دس تنکہ جزیہ مقرر کیا جو معاشی طور پر سب سے نچلے طبقہ کے لیے مروجہ شرح تھی۔[93] مزید براں برہمنوں پر جزیہ عاید کیے جانے کے واقعہ سے ایک اور اہم نکتہ ظاہر ہوتا ہے جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے یہ اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو حکومت کے کسی اقدام یا فیصلہ کے خلاف اظہارِ ناراضگی یا احتجاج کا حق حاصل تھا اور یہ کہ حکومت اس نوع کے ردعمل کو روکنے کے بجائے سنجیدگی سے اس پر توجہ دیتی تھی۔

معاصر مورخین کے بیانات سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ سلطان اپنے جملہ عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے متفکر رہتا تھا اور اس کے اہتمام میں اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے کوئی امتیازی رویہ نہیں برتا پروفیسر ریاض الاسلام کے خیال کے مطابق اس معاملہ میں سلطان نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک ہی سطح پر رکھا۔[۹۴]

اس کے علاوہ یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ شرعی قوانین کی روشنی میں سلطان نے جرم وسزا کے نظام میں بھی اصلاح کی جس سے وسیع پیمانے پر لوگوں کو راحت ملی۔ اس نے سزائے موت کے آزادانہ استعمال اور ناحق خون بہانے کو سختی سے ممنوع قرار دیا اور بقول ضیاء الدین برنی مسلم وذمی، امیر وغریب، متدین وبے دین سبھی پر اس ممانعت کا اطلاق کیا گیا[۹۵]۔ مزید براں مجرموں کو سزائیں دینے میں جو اذیت ناک طریقے اپنائے جاتے تھے سلطان نے ان پر بھی پابندی عاید کی اور لاشوں کو مثلہ کرنے کی ممانعت کی اور گورنروں کو صاف ہدایت کی کہ وہ سزا کے باب میں احتیاط سے کام لیں اور انسانی جان کے احترام کو ملحوظ رکھیں[۹۶]۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ممانعت کے باوجود اس عہد میں سزاؤں کے غیر شرعی طریقے اختیار کیے جانے اور لاشوں کی بے حرمتی کے بعض واقعات پیش آئے[۹۷]۔ لیکن اس ضمن میں بے ضابطگی وبدنظمی پہلے پائی جاتی تھی اس کا سلسلہ اس دور میں بند ہوا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ یہ انسانی ہمدردی، رحم دلی اور عوام کے ساتھ شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آنے کا جذبہ تھا کہ سلطان نے حتی الامکان جنگ سے احتراز کیا اور ناگزیر حالات میں فوجی مہم کے دوران بھی اگر صلح کی پیشکش ہوئی تو اس نے بلا تاخیر اسے قبول کیا[۹۸]۔ واقعہ یہ ہے مورخین کا عام طور پر اس پر اتفاق ہے کہ سلطان فیروز شاہ نے فوجی مہمات وفتوحات میں بہت زیادہ مصروف رہنے کے بجائے اپنی توجہات اور حکومت کے انتظامی ومالی وسائل کو ملک کی خوشحالی اور عوام کی فلاح وبہبود کے لیے صرف کیا اور سلطان کی یہی پالیسی اس کے طویل عرصہ حکومت میں پورے نظم حکومت پر غالب رہی[۹۹]۔ یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ شریعت کی روشنی میں نظم حکومت میں اصلاح کرتے ہوئے سلطان نے اس امر کو بھی یقینی بنانے کی کوشش کی کہ ایسے لوگوں کو حکومت کے مناصب نہ ملنے پائیں جو شرپسند، غیر دیانت دار، بدطینت ناخدا ترس اور ظالم ہوں (واز استقامت ضابطۂ مذکور (عدل وانصاف) کہ سر جملہ امور جہانداری است ہیچ شریری وبدنفسی وخبیثی وظالمی وبے سعادتی وناخدا ترسی وزشت خوئی بر سرکار مسلمانان وذمیاں نصب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نگشت)۔[۷۳] ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے بجائے شریف، بااخلاق، دیانت دار، خداترس اور انصاف پسند افسران کی تقرری سے کسی خاص طبقہ کو نہیں بلکہ عوام کے مختلف طبقوں کو راحت وسکون ملا ہوگا۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ برنی کے مذکورہ بیان میں سلطنت کے لیے "سرکار مسلمانان وذمیان" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اس زمانہ میں حکومت کے تصور کی وسعت کی دلیل ہے۔

اس طرح شریعت کی روشنی میں کیے گئے فیروز شاہ کے مختلف انتظامی وسماجی اصلاحات کے تجزیہ سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ان میں عوام کی فلاح وبہبود کا جذبہ کارفرما تھا اور ان اصلاحات سے واقعۃً انھیں راحت ملی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ایشور ٹوپا کا یہ تاثر نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا "گو فیروز شاہ کی حکومت اسلامی اصولوں سے لبریز تھی لیکن عوام کی بھلائی وبہبودی اس کا سب سے بڑا فرض تھا اسی اصول کے تحت اس نے تمام بے جا قوانین جن کے تحت رعایا مر رہی تھی ختم کیے تمام وہ چیزیں جو شریعت کے خلاف کسی بھی شعبہ زندگی میں حکومت کو نظر آتی تھیں دور کیں۔ اس تمام اسلامی تحریک میں جس جذبہ نے فیروز شاہ کی شاہی کو زندہ کیا وہ فلاح وبہبود کا اصول تھا۔[۷۴]

یہ عجیب المیہ ہے کہ جدید دور کی تاریخی کتب وتحریروں میں اس طرح کے نکات کو بہت کم سامنے لایا جاتا ہے جب کہ حکومت کی جانب سے عاید کی جانے والی پابندیوں اور قانونی سختیوں کو بہت مشتہر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس عہد میں رفاہِ عام یا اجتماعی فلاح وبہبود کے متعدد ایسے کام انجام پائے جن سے بلا تفریق جملہ عوام فیضیاب ہوئے اور ان میں بعض ایسے تھے جن سے غیر مسلموں کو زیادہ فائدہ پہونچا لیکن ان کے ذکر میں یا تو کم دلچسپی لی جاتی ہے یا انھیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ بعض اسکالرس یہ تصور رکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے رفاہِ عام کے جو کچھ کام انجام دیے ان کا فائدہ صرف مسلمانوں کو پہونچا۔[۷۵] اس لیے اس عہد میں غیر مسلموں کے ساتھ حکمرانوں کے برتاؤ پر روشنی ڈالتے ہوئے تاریخ کے اس پہلو کو بھی اجاگر کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اجتماعی فلاح وبہبود کے میدان میں اس وقت کی حکومت کی کارکردگی اور خدمات کو نمایاں کرنے سے نہ صرف یہ واضح ہوگا کہ مسلم حکمرانوں نے بلا کسی تفریق عوام کی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لی بلکہ یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آئے گی کہ ان حکمرانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ملک کی اقتصادی، سماجی، علمی اور تمدنی ترقی میں بھی بھرپور حصہ لیا اور یہ کہ ان کی حکومت ملک کے لیے "کلنک" نہیں بلکہ وجہ عزوشرف اور ایک عظیم دین تھی۔ یہاں اسی نقطہ نظر (عام بھلائی کے کاموں) سے فیروز شاہ کے دور سے متعلق کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں پہلے برنی کا یہ تاثر نقل کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عوام کے مفاد کے تحفظ اور رعایا کی خبرگیری میں فیروز شاہ سے بڑھ کر کوئی اور سلطان اس سے قبل نہیں گذرا ہے[۱۰۳]۔ معاصر مآخذ سے اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ سلطان نے ایک دو نہیں بلکہ متعدد کام محض عوام کی بھلائی کے نقطہ نظر سے انجام دیے۔ مثال کے طور پر تخت نشینی کے بعد اس کے اوّلین اقدامات میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے کسانوں پر سے کروڑوں ٹنکے معاف کر دیئے جو اس کے پیشرو سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ سے تقاوی کی صورت میں انھیں دیے گئے تھے، اس قرض کی معافی میں یہ احساس کارفرما تھا کہ اس کی وصولی کی صورت میں کسان اور زیادہ زبوں حالی کا شکار ہو جائیں گے جیسا کہ معاصر مورخ عفیف کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[۱۰۴] اس عہد میں سرکاری اخراجات پر متعدد نہریں بھی تعمیر کی گئیں، نئے آباد شدہ شہروں میں پانی کی سپلائی کے علاوہ یہ نہریں آب پاشی کے لیے بھی مفید ثابت ہوئیں اور زراعت کی ترقی خاص طور سے بنجر و بیکار زمینوں کی آبادکاری کا ذریعہ بنیں[۱۰۵] ان میں سے بعض نہروں کا فیض آج بھی جاری ہے۔ پروفیسر قمرالدین کی تحقیق کے مطابق پنجاب کی مغربی جمنا نہر اصلاً عہد فیروز شاہی کی ایک نہر ہے جسے جدید طور پر مزید بہتر اور مفید بنایا گیا ہے[۱۰۶] اُس زمانہ میں شہروں میں پانی کی فراہمی کے خاص ذرائع تالاب، حوض و کنوئیں تھے۔ سلطان نے ان کی تعمیر میں گہری دلچسپی لی اور جو پرانے تھے ان کی مرمت کا اہتمام کیا[۱۰۷]۔ اسی سلطان کے عہد حکومت میں مختلف علاقوں میں سیکڑوں کی تعداد میں سرائیں تعمیر ہوئیں جن سے عام مسافروں اور تاجروں دونوں کو سفر کے دوران کافی سہولتیں فراہم ہوئیں اور عفیف کے بقول یہ سرائیں ہمیشہ آنے جانے والوں سے آباد رہتی تھیں[۱۰۸]۔ مزید براں علاج و معالجہ میں آسانی کے لیے سلطان نے شفاخانے قائم کیے جن کی تعداد پانچ بتائی گئی ہے۔ دہلی میں اس نے جو مشہور دارالشفا قائم کیا تھا اس کے بارے میں خود اس کے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عام و خاص ہر طبقہ کے لوگوں کو علاج کی سہولتیں مہیا تھیں۔ تشخیصِ مرض و تجویز دوا و پرہیز کے لیے وہاں اطبا حاضر رہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مریضوں کو دوا و غذا دونوں مفت اوقاف کی آمدنی سے فراہم کی جاتی تھی (دیگر حق تعالےٰ میسر گردانید کہ دار الشفا بنا کردیم تا از خاص و عام ہر کرا مرض طاری می شود و بہ رنجی مبتلا می گردد آنجا بیاید۔ اطبا حاضر می باشد تا تشخیص مرض کنند و علاج و پرہیز فرمایند و دوای آں بدہند، وجہ دوا و غذا از سہام اوقاف بدہند۔ جمہور مریضاں از مقیم و مسافر، وضیع و شریف و احرار و عبید آنجا می آیند و معالجہ ایشاں می شود از فضل و کرم حق شفا می یابند)[١٠٩]

مورخین کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان سرایوں اور شفاخانوں سے نہ صرف یہ کہ سب کو فائدہ اٹھانے کی آزادی حاصل تھی بلکہ اس بات کے ثبوت بھی ملتے ہیں کہ ذمیوں کے آرام و آسائش کے لیے مخصوص انتظام ہوتے تھے[١١٠]۔ ان سب کے علاوہ متعدد بندوں، پلوں اور تعلیمی اداروں کی تعمیر اور نئے شہروں کی آبادکاری سلطان کے رفاہِ عام کے کاموں میں شامل ہیں جن میں خاص طور سے فیروز آباد، حصار فیروزہ، فتح آباد اور جونپور قابل ذکر ہیں[١١١]۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں سلطان کی دلچسپی صرف انہی کاموں تک محدود نہ تھی بلکہ معاصر مآخذ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ فیروز شاہ نے اس وقت کے محدود وسائل کی روشنی میں بیروزگاری کے انسداد کی تدبیر کی۔ ان کے حکم سے کوتوال دہلی نے محلہ داروں کی مدد سے شہر کے تمام لوگوں کے حالات کی چھان بین کر کے بیکار لوگوں کی ایک فہرست تیار کی اور اسی کے مطابق سلطان نے بیکار لوگوں کو ان کی صلاحیت و استعداد اور خاندانی حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کام پر لگایا[١١٢]۔ نادار و غریب لڑکیوں کی شادی کے انتظام کے لیے سلطان نے دیوانِ خیرات کے نام سے ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور یہ عام اعلان کرا دیا کہ غریب لوگ جن کے یہاں شادی کے قابل لڑکیاں ہوں وہ اپنا نام اس محکمہ میں درج کرائیں۔ اس محکمہ کے افسران نام درج کرانے والوں کے حالات کی تحقیق کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کی حالت و ضرورت کی مناسبت سے مالی امداد فراہم کرتے تھے[١١٣]۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ نے قید خانوں کو سدھارنے اور قیدیوں کی حالت بہتر بنانے میں بھی دلچسپی لی۔ ہر مہینہ کے شروع میں اس کی ہدایت کے مطابق قیدیوں کے حالات کی مفصل رپورٹ اسے پیش کی جاتی تھی اور وہ اسی کی روشنی میں قید خانوں کی اصلاح کے لیے قدم اٹھاتا تھا[١١٤]۔ سماج کے ان مخصوص مسائل پر توجہ دینے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ ساتھ سلطان نے عام غربا، ومساکین اور مستحقین کو مالی امداد فراہم کرنے کے لیے ایک اور شعبہ قائم کیا جو "دیوانِ استحقاق" کے نام سے معروف ہوا، معاصر مورخین کے بیان کے مطابق یہ شعبہ سالانہ تقریباً ۳۶ لاکھ ٹنکے غریبوں و حاجت مندوں میں امداد کے طور پر تقسیم کرتا تھا۔[۱۱۵] ان تفصیلات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہد فیروز شاہی میں عوام کی فلاح وبہبود کے کاموں میں حکومت کی سرگرمیاں مختلف جہات میں جاری ہوئیں، دوسری جانب ان سے اس خیال کا بے بنیاد ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کہ فیروز شاہ نے رفاہِ عام کے جو کچھ کام کیے ان کا فائدہ ایک خاص طبقہ یا مسلمانوں تک محدود رہا۔ سلطان کے رفاہ عامہ کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز مورخ سر ولزلی ہیگ Sir Wolseley Haig نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ان امور کی انجام دہی میں عوام کی بھلائی سے زیادہ نام ونمود کی خواہش کو دخل تھا۔[۱۱۶] اول تو یہ تاثر ہی صحیح نہیں ہے جیسا کہ خود سلطان نے متعدد مقام پر یہ واضح کیا ہے کہ ان کاموں سے اس کا مقصد محض شہرت ونیکنامی نہیں بلکہ عوام کی بھلائی ہے۔[۱۱۷] دوسرے اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو کم ازکم اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ان کاموں کا فائدہ بلا کسی امتیاز عام لوگوں کو پہونچا۔ سلطان کے ان کاموں پر جے ایم بنرجی نے بہت صحیح تبصرہ کیا ہے خود ان کے اپنے الفاظ ہیں:۔

> In every scheme of public works, the only motive that had inspired the sultan to action was the general welfare of the people. As such it is very difficult to agree with the views of Sir Wolseley Haig that the public works of Firoz Shah were the outcome of his vanity.[۱۱۸]

آخر میں سلطان کی شخصیت کا یہ پہلو واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی وسعت نظری اور فراخ دلی کے مظاہر، علمی دنیا میں بھی ملتے ہیں۔ اس کی علمی دلچسپی نہ تو خاص دائرہ تک محدود تھی اور نہ علوم وفنون کی اشاعت اور اہلِ علم وفن کی قدردانی وہمت افزائی میں اس نے کسی تنگ نظری کا ثبوت دیا۔ بلاشبہ اسلامی علوم بالخصوص اسلامی کی ترویج واشاعت میں سلطان نے نمایاں حصہ لیا اور فتاوای فیروز شاہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فتاوای تاتارخانی اور فوائد فیروزشاہی جیسی اہم تصانیف اسی زمانہ کی یادگار ہیں، لیکن اس کے شواہد بھی کچھ کم نہیں ہیں کہ تاریخ، علم ہیئت، طب اور زیر بحث موضوع کے لحاظ سے زیادہ اہم یہ کہ بعض ہندوستانی علوم کی اشاعت میں اس نے دلچسپی لی اور اس اسلامی روایت کو تقویت پہونچائی کہ علم یا علمی خدمات کی قدردانی میں کوئی تفریق روا نہیں رکھنی چاہیے ابن بی رائے نے سلطان کی اس روش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

It is well-known that the Sultan's love of learning transcended the barriers of creed.[119]

اس ضمن میں یہ قابل ذکر ہے کہ نگرکوٹ (کانگڑہ۔ہماچل پردیش) مہم کے دوران اسے جوالا مکھی مندر میں سیکڑوں سنسکرت کتابیں ملی تھیں جنھیں وہ دہلی لے آیا ان میں علم نجوم اور بعض دوسرے موضوعات سے متعلق جو اہم کتابیں تھیں ان کا فارسی ترجمہ ہندو اور مسلم اسکالرس کی مدد سے کرایا۔علم نجوم پر ایک کتاب کا ترجمہ (مترجم: عزالدین خالد خانی) سلطان کے نام پر "دلائل فیروزشاہی" کے نام سے موسوم ہوا۔[120] اسی فن پر ایک دوسری ہندوستانی کتاب (باراہی سنکھتا) کا فارسی ترجمہ (کتاب النجوم) بھی اسی دور کی یادگار ہے[121]: ترجمہ مولف تاریخ فیروزشاہی شمس سراج عفیف کے ہاتھوں پایۂ انجام کو پہونچا۔مزید براں اس دور میں حکومت کی سرپرستی میں طب، موسیقی و کشتی سے متعلق بھی سنسکرت کی کتابوں کے فارسی میں ترجمہ کا ذکر ملتا ہے[122] اس نوع کے تراجم سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے قدیم علوم سے متعارف ہونے کا موقع ملا بلکہ یہ ان علوم کے تحفظ و اشاعت کا ذریعہ بھی بنے اہم بات یہ کہ مختلف علوم و فنون کی سنسکرت کتابوں کے فارسی ترجمہ کی یہ پہلی روایت ہے جو دہلی سلطنت کے وجود میں آنے کے بعد قائم ہوئی اور یہ یقیناً ہندوستانی علوم میں فیروزشاہ کی دلچسپی کا ایک مظہر ہے، بعض جدید مورخین کے یہاں علمی سرپرستی میں سلطان کی اس فراخدلی کا واضح لفظوں میں اعتراف ملتا ہے[123] جب کہ بعض نے یہ قابلِ حیرت رائے ظاہر کی ہے کہ سنسکرت یا ہندوستانی علوم میں سلطان کی دلچسپی ان کتابوں کے فارسی ترجمہ کا باعث نہیں تھی بلکہ اس کی اصل وجہ ان کی علمی افادیت تھی[124] اگرچہ یہ رائے قبول کرلی جائے تب بھی کم از کم یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علم نجوم یا ہیئت کے میدان میں قدیم ہندوستان کی علمی خدمات اور ان کی عملی افادیت کو سلطان نے تسلیم کیا اور یہ بجا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر علمی قدر دانی میں اس کی وسیع النظری کی دلیل ہے۔ مزید برآں سلطان کے بارے میں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ اس نے جین فرقہ کے تین ممتاز اشخاص (گونابھدراسوری، منی بھدراسوری و مہندراسوری) کو خاص اعزاز و اکرام سے نوازا تھا۔ ان میں تیسرے ماہر ریاضیات و ہیئت کی حیثیت سے کافی مشہور تھے[۱۲۵] بعض مورخین کے بیان کے مطابق سلطان ایک ہندو شاعر رتن سنگھ کا بڑا معتقد تھا اور اس کے دربار میں اس شاعر کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی[۱۲۶] یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ قدیم ہندوستان کے بعض علوم وفنون کی اشاعت کے علاوہ سلطان فیروز شاہ نے ہندوؤں کے آثار قدیمہ میں بھی دلچسپی لی۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ سلطان نے اپنے پیشرو سلاطین دہلی کے زمانہ کی متعدد عمارتوں یا تعمیراتی یادگاروں (جو عام لوگوں کے استعمال میں آتی تھیں) کی مرمت کرائی اور انھیں تحفظ بخشا[۱۲۷] سیرت فیروز شاہی سے یہ شہادت ملتی ہے کہ حوض معظم مبارک خاں کی مرمت کے دوران اسے ایک کنواں، بند اور کچھ قدیم عمارتیں ملیں جو برہمنوں کی تعمیر کردہ تھیں۔ سلطان نے ان کی بھی مرمت کرائی اور انھیں ان کے پرانے بانیوں کے نام سے باقی رکھا[۱۲۸] سلطان نے جس اہتمام سے اشوک کی لاٹ میرٹھ سے منتقل کرا کے دہلی میں نصب کرایا اور معاصر مورخین نے جس تفصیل سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے[۱۲۹] اس سے بھی ہندوؤں کے تاریخی آثار میں سلطان کی دلچسپی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

معروضات بالا سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ فیروز شاہ تغلق اور عہد وسطیٰ کے دوسرے مسلم حکمرانوں کے برتاؤ سے متعلق کیسے کیسے غلط تاثرات اور کن کن بنیادوں پر جنم پاتے ہیں۔ حقائق کو جھٹلانے یا نظر انداز کرنے سے جو غلط تاثرات ابھرتے ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں ان کے علاوہ مآخذ کی غلط ترجمانی یا ان میں بیان کردہ ایک دو واقعہ سے عمومی نتیجہ اخذ کرکے پورے عہد کی تصویر بگاڑی جاتی ہے۔ تاریخی کتب اور دوسرے مآخذ میں جہاں ہندوؤں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی مثالیں ملتی ہیں وہاں یقیناً زیادتی کے کچھ واقعات بھی سامنے آتے ہیں لیکن ان موخرالذکر واقعات کو اس زمانے کی عام روش اور مسلم حکمرانوں کا متفقہ طرز عمل قرار دینا نہ تو تاریخ کے ساتھ انصاف ہے اور نہ علمی و تحقیقی کاوشوں کا صحیح رخ ہے۔ اوپر کے مباحث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے بارے میں جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلط تاثرات پیدا کیے جاتے ہیں اس کے خاص اسباب یہ ہیں (۱) عہد وسطیٰ کے مزاج، معاصر مورخین کے انداز بیان اور ان کی تحریروں کے مقاصد کو نہ سمجھنا یا سمجھنے کے باوجود ان کو زیر غور نہ لانا (۲) تاریخی واقعات کو ان کے سیاق وسباق میں نہ دیکھنا اور کسی معاملہ میں اخذ نتائج کے لیے اکادکا واقعات کو بنیاد بنانا (۳) غیر مسلموں کے مختلف طبقوں (ذمی وحربی، مطیع وباغی) میں تمیز نہ کرنا۔

ان سب کے علاوہ مذکورہ بالا تفصیلات سے اس خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ کسی حکمراں کے دینی رجحان یا نظم ونسق میں شریعت کی پابندی کا لازمی نتیجہ تعصب وتنگ نظری یا غیر مسلموں کے ساتھ زیادتی وناانصافی ہے۔ واقعہ یہ ہے (جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا) کہ دینی رجحان رکھنے والے اور شریعت کی پابندی پر زور دینے والے سلاطین کے یہاں ان حقوق کی تکمیل میں توجہ ودلچسپی کا زیادہ مظاہرہ ملتا ہے جو اسلامی شریعت نے غیر مسلموں کے لیے متعین کیے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے حکمرانوں کے عہد میں رعایا کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اور منصفانہ برتاؤ کے امکانات زیادہ رہتے ہیں۔ آخر میں اس جانب بھی اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں اسلامی حکومت کے تحت ذمیوں کو جو حقوق دیے گئے ہیں اگر انھیں صحیح معنوں میں پورا کیا جائے اور اسلام نے فلاحی ریاست کا جو تصور پیش کیا ہے اگر دیانت داری کے ساتھ اسے عملی جامہ پہنایا جائے تو پھر اس حقیقت سے انکار مشکل ہو جائے گا کہ اسلامی حکومت میں ذمیوں یا غیر مسلم شہریوں کو پوری طرح سماجی ومعاشی تحفظ حاصل ہوتا ہے اور ان کے ساتھ کسی امتیازی سلوک کے بجائے عدل وانصاف کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ہندوؤں کی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے بجا فرمایا ہے ..... " اورنگ زیب نے باتفاق جمیع علماء حنفیہ ہند ہندوؤں پر جزیہ کے احکام جاری کیے تھے نادانی و بے خبری سے ہندوؤں نے سمجھا کہ یہ ان کی تذلیل وتحقیر ہے۔ حالانکہ اگر اس وقت علماء محققین ہوتے اور وہ جزیہ کی غرض وغایت اور اہل ذمہ کے حقوق معتبر فی الشرع کو کھول کھول کر بیان کرتے تو ہندوؤں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ ان کی تذلیل نہیں بلکہ وہ بہتر سے بہتر سلوک ہے جو دنیا میں کوئی حاکم قوم محکوموں کے ساتھ کر سکتی ہے۔[۱۳۱] حقیقت

۱۳۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو عام کرتے ہوئے اور اس کی تعلیمات کو پھیلاتے ہوئے اسلامی نظامِ حکومت کے اس پہلو کو بھی صاف صاف لفظوں میں واضح کرنے کی سخت ضرورت ہے اور اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اسلام، اسلامی نظام اور مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیوں سے بھرپور آج کے ماحول میں یہ ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔

حواشی و مراجع

۱؎ Murray T. Titus: Indian Islam (A Religious History of Islam in India) New Delhi 1979, pp. 18-19.

۲؎ ابو یوسف، کتاب الخراج، مطبعہ سلفیہ قاہرہ، ۱۳۵۲ھ، ص ۱۲۲ ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مصر ۱۹۰۹ء، ص ۱۲۷-۱۳۰، امین احسن اصلاحی، غیر مسلموں کے حقوق، کراچی، ۱۹۵۳ء ص ۵۲-۵۵، شبلی نعمانی مقالاتِ شبلی حصہ اول (مقالہ: الجزیہ) مطبع معارف اعظم گڑھ، ص ۲۲۱-۲۳۱

۳؎ ابو یوسف، کتاب الخراج ص ۱۲۲، ۱۲۹-۱۲۹ ابوالحسن علی المرغینانی، الہدایہ، لکھنو ۱۳۲۵ھ ۳/۵۷۲، شیخ نظام وغیرہ، الفتاویٰ الہندیہ (فتاوائے عالمگیری) داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۸۰ء ۲/۲۴۴-۲۴۵

۴؎ ابن رشد القرطبی، بدایۃ المجتہد، قاہرہ ۱۹۵۲ء ۱۰/۳۶-۳۷، الماوردی، محولہ بالا ص —، محمد بن احمد الانصاری القرطبی، احکام القرآن، مرکز تحقیق التراث، مصر ۱۹۸۷ء، ۸/ ۱۱۰

۵؎ ابوالکلام آزاد، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، مکتبہ ماحول کراچی ۱۹۶۰ء، ص ۸

Khaliq Ahmad Nizami: Religion and Politics in the 13th Century India, Delhi - 1974 p. 308.

۶؎ محمد بن ادریس الشافعی، کتاب الام، مطبعہ امیریہ، بولاق، مصر ۱۳۲۲ھ ۴/۹۵، ۹۶ القرطبی، احکام القرآن، محولہ بالا، ۸/ ۱۱۰

۷؎ ابو یوسف: محولہ بالا، ص ۱۲۹، امین احسن اصلاحی، محولہ بالا، ص ۱۲-۱۳

۸؎ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۲۹۰، امیر خسرو، مثنوی دول رانی خضر خاں علی گڑھ، ۱۹۱۷ء ص ۴۶، ۴۷، شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ: اٹو اسپیس) علی گڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنہ ۱۹۴۳ء، ص ۳۷۔ ابو العباس القلقشندی، صبح الاعشیٰ، مطبع امیریہ، القاہرہ، سنہ ۱۹۱۵ء، ۶۹/۵، سید عبدالحی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، دمشق، سنہ ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۳

۹؎ علی بن حامد الکوفی، چچ نامہ، مجلس مخطوطات فارسیہ، حیدرآباد، سنہ ۱۹۳۹ء، ص ۲۰۸-۲۰۹-۲۱۲

۱۰؎ چچ نامہ، ص ۲۱۸

۱۱؎ احمد بن یحییٰ البلاذری، فتوح البلدان، بیروت، سنہ ۱۹۵۸ء، ص ۶۱۳-۶۱۴

۱۲؎ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی سنہ ۱۹۸۱ء، ص ۶۷۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، معارف پریس اعظم گڑھ سنہ ۱۹۷۰ء، ص ۴۹

۱۳؎ چچ نامہ، ص ۲۱۴، بلاذری، ص ۶۱۷

۱۴؎ کلمات طیبات (مشتمل بر مکتوبات غوث الثقلین و مرزا مظہر جانجاناں، قاضی ثناء اللہ پانی پتی و مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) مطبع مطلع العلوم، مرادآباد، سنہ ۱۸۹۱ء، ص ۲۷-۲۸

۱۵؎ جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، ص ۸۱-۸۲

۱۶؎ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۶۷، ۱۱۱ بحوالہ ضیاء الدین برنی، صحیفہ نعت محمدی (مخطوطہ رامپور)

۱۷؎ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۶۷۔

۱۸؎ سید نورالدین مبارک کے حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: امیر حسن سجزی، فوائد الفواد (تحقیق و تصحیح محمد لطیف ملک) لاہور، سنہ ۱۹۶۶ء ص ۳۲۴، ۲۰۱، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی، دہلی سنہ ۱۳۳۲ھ، ص ۲۸-۲۹، محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار (اردو ترجمہ از فضل احمد) سنہ ۱۳۲۶ھ، ص ۶۷

۱۹؎ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۱-۴۲

۲۰؎ حوالہ مذکور، ص ۲۹۱

۲۱؎ Religion and Politics in the 13th Century India op.cit. pp. 107, 317. P. Hardy: Historians of Medieval India Luzac & Co. pp. 28-29.

۲۲؎ اس کتاب کے انداز بحث و خلاصہ مباحث کے لیے ملاحظہ فرمائیں
Mohammad Habib: Introduction to the Political Theory of the Delhi Sultanate (English Translation of Fatawa-e-Jahandari) Allahabad (N.D.) pp. I-XII.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۳ء برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۰-۱۹۱

۲۴ء ضیاء الدین برنی، فتاوائے جہانداری، روٹوگراف ۶۸ء (مخطوطہ انڈیا آفس) ریسرچ لائبریری شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۱۲ الف۔

۲۵ء برنی نسلی ونسبی امتیاز کے قائل تھے اور اسی بنیاد پر وہ انسانوں کو دو طبقوں (شریف و رذیل) میں تقسیم کرتے تھے اور وہ صرف پہلے ہی طبقہ کے لوگوں کو حکومت کے اہم مناصب کا مستحق سمجھتے تھے (فتاوائے جہانداری ۲۱۶ ب - ۲۲۰ الف)

۲۶ء فتاوائے جہانداری، اوراق ۱۱۹ب - ۱۲۰ الف)

۲۷ء برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۱، نیز دیکھئے ص ۸۷، ۱۲۱، ۵۷۳، ۵۷۵، فتاوائے جہانداری ۱۲۰ الف۔

۲۸ء R. Levy: The Sociology of Islam, London 1933 II 263.

۲۹ء فخر مدبر، آداب الحرب والشجاعۃ، تہران (ب-ت) ص ۴۰۲، یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، عفیف، تاریخ فیروز شاہی، صفحات ۱۳۳، ۴، ۱۵۰، ۱۸۰، ۱۸۱، ۳۶۶، ۳۸۲-۳۸۴۔ رزق اللہ مشتاقی، واقعات مشتاقی روٹوگراف ۳ء (مخطوطہ برٹش میوزیم) ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی، ورق ۱۵ عبداللہ داؤدی، تاریخ داؤدی، علی گڑھ، ص ۲۹-۳۰

۳۰ء عین الدین ماہرو، انشاء ماہرو (مرتبہ شیخ عبدالرشید) علی گڑھ۔

۳۱ء فتوحات فیروز شاہی (مرتبہ شیخ عبدالرشید) علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، صفحات، ۵، ۹، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۰

۳۲ء سیرت فیروز شاہی نقل (مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) یونیورسٹی کلکشن ۱۱۱ء مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) ص ۱۲۸۔

۳۳ء شرف بن محمد العطائی، فوائد فیروز شاہی، مخطوطہ، جواہر میوزیم کلکشن (مولانا آزاد لائبریری) ۶۸۷ء، ورق ۱۱۵ ب۔

۳۴ء دارالحرب یا ایسے علاقہ و ملک کا باشندہ جس میں اور مسلم حکومت کے مابین جنگ کا ماحول قدیم ہو۔

۳۵ء سیرت فیروز شاہی، ص ۱۲۸

۳۶ء عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۸۰، نیز دیکھئے فتوحات فیروز شاہی، ص ۹

۳۷ء اس مجموعہ فتاویٰ کے مفصل تعارف کے لیے دیکھئے راقم کا مضمون "فتاوائے فیروز شاہی اور عصری مسائل، برہان ۹۱/۲۰۱، جولائی، اگست ۱۹۸۳ء ص ۲۱-۳۴، ۲۰-۴۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۸ اس کتاب کے تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیں K.A. Nizami: Supplement to Elliot & Dowson's History of India, Delhi 1981, p. 117.

۳۹ فتاوائے تاتارخانی کی اولین چار جلدیں (مرتبہ قاضی سجاد حسین مرحوم) دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہیں۔ اس فتاویٰ کے تعارف کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ ریاست علی ندوی، کچھ فتاوای تاتارخانی کے بارے میں، معارف، ۳/۵۹، ستمبر ۱۹۴۷ء، ص ۱۶۵-۱۸۰

۴۰ فتاوای فیروزشاہی، مخطوطہ، مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن ۲۶، ورق ۲۱۲ الف۔ب

۴۱ فوائد فیروزشاہی، محولہ بالا، ورق ۱۱۶ الف

۴۲ فتاوائے فیروزشاہی، ۲۱۸ الف۔ب، فوائد فیروزشاہی، ۱۱۶ الف

۴۳ فتاوائے فیروزشاہی، ۲۲۴ الف، ۲۵۰ الف، ۲۵۳ الف، ۲۵۴ الف، ۲۵۵ الف، ۲۴۲ الف ۲۵۴ الف، ۲۷۴ الف۔

۴۴ فتاوائے فیروزشاہی، ۳۶ الف۔ ۲۳۷ ب، ۹۸۴ ب۔

۴۵ فتاوائے فیروزشاہی، ۵۰۸ الف ۴۶ فتاوائے فیروزشاہی ۵۰۸ ب۔

۴۷ فتاوائے جہاں داری ۱۱۹ ب۔

۴۸ R.C. Jauhari: Firoz Tughlaq New Delhi 1968, pp.150-51.

۴۹ عفیف، تاریخ فیروزشاہی، ص ۳۷۹-۳۸۲

۵۰ Kanhaiya Lall Srivastava: The position of Hindus under the Delhi Sultanate, New Delhi 1980 p. 223.

۵۱ فتوحات فیروزشاہی، ص ۸-۹: نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ۲۴۰/۱ طبقات اکبری ۲۴۰/۱۰۔ سجان رائے بھنڈاری، خلاصۃ التواریخ، دہلی ۱۹۱۸ء، ص ۲۵۰

۵۲ فتوحات فیروزشاہی، ص ۹-۱۰

۵۳ سریواستوا محولہ بالا، ص ۱۱۱

۵۴ ایم ٹائیٹس، ص ۱۸، ۲۸-۲۹ ، سریواستوا، ص ۸۷، جوہری، ص ۱۰۰

۵۵ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ: اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق، مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۲۲-۲۶

۵۶ سریواستوا، ص ۹۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۷؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم کا مقالہ "عہد فیروز شاہی کا نظم محاصل شرعی قوانین کی روشنی میں" تحقیقاتِ اسلامی ۳/۱ جنوری۔مارچ ۱۹۸۴ء صـ۲۸۔۴۲

۵۸؎ اسلامی قانون کی رو سے (جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا) عورتیں، بچے، معذور نادار کے علاوہ عبادت گاہوں کے خدام اور رہبان بھی جن کا گذر بسر نذرانہ و خیرات پر ہوتا ہے) جزیہ سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں (ابو یوسف کتاب الخراج، صـ۱۲۲، الاحکام السلطانیہ، صـ۱۲۷۔۱۳۰) معاصر علماء کی رائے میں برہمن اس آخری زمرہ میں بھی شامل نہیں کیے جا سکتے تھے۔

۵۹؎ عفیف، صـ۳۸۲۔۳۸۴ ۶۰؎ بنرجی، صـ۱۲۴

۶۱؎ ایم ٹائٹس، محولہ بالا، صـ۲۸، نیز دیکھئے Aziz Ahmad: Studies in Islamic Culture in the Indian Environment Oxford 1984, p. 80.

۶۲؎ چچ نامہ، صـ۲۰۸۔۲۰۹ ۶۳؎ چچ نامہ، صـ۲۰۹، ۲۱۱

۶۴؎ I.H. Quraishi: The Administration of the Sultanate of Delhi, Karachi 1958, pp. 206-7, 210-11.

۶۵؎ ایم ٹائٹس، صـ۲۲۔۲۵ ۶۶؎ سریواستوا، صـ۱۰۹، ۱۱۰

۶۷؎ فتوحات فیروز شاہی، صـ۹۔۱۰، نیز دیکھئے، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، صـ۳۷۴ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۷۵ء، صـ۹۸۔۹۹

۶۸؎ بنرجی، صـ۱۶۷ ۶۹؎ بنرجی صـ۱۶۸

۷۰؎ ایشور ٹوپا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، صـ۸۹

۷۱؎ Riyazul Islam: A Review of the Reign of Firoz Shah' Islamic Culture Vol. 23/4 Oct. 1949, p. 285.

۷۲؎ سریواستوا، صـ۹۴ ۷۳؎ حوالہ مذکور حاشیہ ۲ ۷۴؎ چچ نامہ، صـ۲۱۲۔۲۱۳

۷۵؎ ایم ٹائٹس، صـ۲۴ ۷۶؎ فتوحات فیروز شاہی، صـ۹

۷۷؎ سریواستوا، صـ۱۴۹، بنرجی، صـ۱۷۱، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، صـ۴۳۵۔۴۳۶

۷۸؎ عماد الحسن آزاد فاروقی (مرتب) ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء (مقالہ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی: دہلی سلطنت کے نظم و نسق میں ہندوؤں کا حصہ) نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، صـ۱۹! — Mohammad Qamruddin: Society and Culture in Early Medieval India,, New Delhi 1985, p. 62.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۷۹۔ عزیز احمد، محولہ بالا، ص ۱۰۲

۸۰۔ برنی، ۲۸۷-۲۸۸، ۲۹۱، ۲۹۲ - ۳۰، ۵۸۸، سیرت فیروز شاہی، ص ۱۳، انشاء ماہرو (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) علی گڑھ (ب۔ت) ص ۹، ۱۵، ۲۰، ۲۱-۲۱ نیز دیکھئے قریشی، محولہ بالا، ص ۲۰۷-۲۰۸، ۲۱۰، ۲۲۳-۲۲۴

۸۱۔ سریواستوا، ص ۱۷۱

۸۲۔ فتاوای جہانداری، ۱۲۰ الف

۸۳۔ عفیف، ص ۱۰۳

۸۴۔ عفیف، ص ۳۴۴-۳۴۹، ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی تحقیق کے مطابق یہ "گوجر شاہ" ہے۔ دیکھئے ان کا محولہ بالا مقالہ، ص ۲۶ اور فٹ نوٹ نمبر ۵۵

۸۵۔ جمالی، سیر العارفین، مطبع رضوی، دہلی ۱۳۱۱ھ، ص ۱۵۹

۸۶۔ برنی، ص ۱۷۱، ۵۸۷ - ۵۸۸، ۵۹۵ عفیف، ص ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۲۸۔ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۳

۸۷۔ محمد یٰسین مظہر صدیقی، عہد سلطنت کے نظم و نسق میں ہندوؤں کا حصہ، محولہ بالا، ص ۲۶ بحوالہ:

Qiyamuddin Ahmad : Corpus of Arabic & Persian inscriptions of Bihar, Patna, 1973, p. 61.

۸۸۔ عہد فیروز شاہی پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض جدید مورخین (جن میں مسلم و ہندو دونوں شامل ہیں) نے اس نکتہ کو خاص طور سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ کریں

S. Moinul Haq: Baranis History of the Tughlaqs Karachi 1959, pp. 91-93, J.M. Banarji, History of Firoz Shah Tughlaq, Delhi, 1967 pp. 166-69.

۸۹۔ سماجی و اخلاقی اصلاح کے لیے فیروز شاہ کی کوششوں کے مطالعہ کے لیے دیکھئے خاکسار کا مقالہ "فیروز شاہ تغلق کی دینی و سماجی خدمات" تحقیقات اسلامی ۵/۲، اپریل، جون ۱۹۸۶ء ص ۴۶-۵۷

۹۰۔ برنی، ص ۵۷۲، عفیف ص ۹۴

۹۱۔ فتوحات فیروز شاہی، ص ۵-۶، عفیف، ص ۲۷۵-۲۷۹، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے قریشی محولہ بالا، ص ۲۴۴-۲۴۷ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۲۰-۴۲۳

۹۲۔ معین الحق، محولہ بالا، ص ۹۲

۹۳۔ حنفی مسلک کے مطابق ذمیوں کو مالی اعتبار سے تین طبقوں (اعلیٰ، متوسط، ادنیٰ) میں تقسیم کر کے ایک متعین تناسب کے ساتھ جزیہ عائد کیا جاتا ہے، شافعی و مالکی فقہاء کے نزدیک جزیہ کے نفاذ کے لیے ذمیوں کی طبقاتی تقسیم ضروری نہیں اور مقدار جزیہ کی تعیین امام یا سلطان کی صوابدید پر منحصر ہو گی (الماوردی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ص ۱۲۸، الہدایہ ۲/ ۵۷۰ - ۵۷۱) برہمنوں پر یکساں طور پر جزیہ کی کم سے کم مقدار متعین کر کے فیروز شاہ نے غیر حنفی مسلک کی اتباع کی اور ان کے سلسلے میں مزید نرمی کا ثبوت دیا۔

۹۴؎ برنی، ص ۵۵۴، عفیف، ص ۱۳۳، ۱۵۴، نیز ملاحظہ فرمائیں:

Riyazul Islam : "A Review of the reign of Firoz Shah" Islamic Culture Vol. 23/4 Oct. 1949, p. 285.

۹۵؎ برنی، ص ۵۷۲ - ۵۷۳   ۹۶؎ فتوحات فیروز شاہی، ص ۲-۳، انشا ماہرو ص ۵

۹۷؎ فتوحات فیروز شاہی، ص ۲-۳، عفیف، ص ۹۰، ۳۸۱، سیرت فیروز شاہی، ص ۳۲-۳۳، ۱۵۳ - ۱۵۴

۹۸؎ سیرت فیروز شاہی، ص ۷۵-۷۶، نیز دیکھئے معین الحق، محولہ بالا، ص ۹۲

۹۹؎ برنی، ص ۵۷۲، ۵۹۹، عفیف، ص ۲۹۳، فتوحات فیروز شاہی، ص ۳-۶، ۱۱، ۱۷   ۱۰۰؎ برنی، ص ۵۷۵

۱۰۱؎ ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، ص ۷۷

۱۰۲؎ سریواستوا، ص ۹۶، جوہری، ص ۱۱۴-۱۱۵، نیز ملاحظہ کریں ریاض الاسلام، محولہ بالا، ص ۲۸۵

۱۰۳؎ برنی، ص ۵۵۳، نیز دیکھئے عفیف، ص ۹۱، یحییٰ سرہندی، ص ۱۳۱

۱۰۴؎ عفیف، ص ۹۲

۱۰۵؎ برنی، ص ۵۶۸ - ۵۷۰، عفیف، ۱۲۹ - ۱۳۰۔ سیرت فیروز شاہی، ص ۲۱۱-۲۱۲۔ یحییٰ سرہندی، محولہ بالا، ص ۱۲۵ - ۱۲۶، نیز دیکھئے W.H. MoreLand: The Agrarian System of Muslim India, New Delhi, 1968, p. 59.

۱۰۶؎ Society & Culture in Early Medieval India Op.cit p. 51 (F. No. I)

۱۰۷؎ فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۱-۱۳، سیرت فیروز شاہی۔ ص ۱۵۲ - ۱۵۷، ۲۰۹ - ۲۱۰۔ نظام الدین احمد بخشی ۱/۲۲۱۔ محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱/۱۵۱

۱۰۸؎ عفیف، ص ۳۲۹ - ۳۳۰، نظام الدین احمد ۱/۲۲۱، فرشتہ ۱/۱۵۱

۱۰۹؎ فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۵-۱۶، نیز دیکھئے عفیف، ص ۳۵۵ - ۳۵۶، نظام الدین احمد ۱/۲۲۱

۱۱۰؎ قریشی، ص ۲۲۰

۱۱۱؎ عفیف، ص ۱۲۴ - ۱۲۸، ۳۲۹ - ۳۳۰، برنی، ص ۵۶۴ - ۵۶۶، نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری، کلکتہ، سنہ ۱۹۱۱ء، ۱/۲۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۱۲ھ عفیف، ص ۳۳۴-۳۳۵ ۱۱۳ھ عفیف، ص ۳۴۹-۳۵۱

۱۱۴ھ عفیف، ص ۵۰۹-۵۱۱ ۱۱۵ھ عفیف، ص ۳۵۹-۳۶۰

۱۱۶ھ S.W. Haig: Cambridge History of India, Delhi, 1958 III/185.

۱۱۷ھ سیرت فیروز شاہی ص ۳، ۱۵۴-۱۵۵، فتوحات فیروز شاہی، ص ۶، ۳، ۱۱، ۱۷، عفیف، ص ۹۱

۱۱۸ھ بنرجی، محولہ بالا، ص ۱۴۶، نیز دیکھئے، قریشی، ص ۲۱۹-۲۲۰

۱۱۹ھ N.B. Roy: The Victories of Sultan Firoz Shah of Tughlaq Dynasty, Islamic Culture Vol. XV/4 Oct. 1941, p. 449.

۱۲۰ھ سیرت فیروز شاہی، ص ۲۹۳، نظام الدین احمد بخشی، محولہ بالا، ۱۰۰/۲۳۳-۲۳۴

۱۲۱ھ کتاب النجوم کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ سر شاہ سلیمان کلکشن (ہیئت و نجوم) ۵۲۶/۵ (اوراق ۱۸۵) نیز دیکھئے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۳۹۹-۴۰۰، سید صباح الدین عبد الرحمٰن ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری مطبع معارف، ۱۹۷۵ء، ص ۹۹-۱۰۰

۱۲۲ھ عزیز احمد، محولہ بالا، ص ۲۱۹، قمر الدین، ص ۵۰-۵۱، سریواستوا، ص ۲۱۹

۱۲۳ھ این بی، رائے، محولہ بالا، ص ۴۴۹

۱۲۴ھ جوہری، ص ۱۵۶

۱۲۵ھ Agha Mahdi Husain: Tughlaq Dynasty, Calcutta 1963, p. 323.

۱۲۶ھ K.M. Pannikar: A Survey of Indian History, Bombay, 1956, p. 131.

۱۲۷ھ فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۲-۱۵، سیرت فیروز شاہی، ص ۱۵۴-۱۵۵، ۲۰۹-۲۱۰

۱۲۸ھ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۵۷، بنرجی، ص ۱۴۵-۱۴۶

۱۲۹ھ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۸۴-۱۸۸، عفیف، ص ۳۰۵-۳۱۵، نیز دیکھئے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۳۵، بنرجی، ص ۱۸۶-۱۸۷، جوہری، ص ۱۷۴-۱۷۶

۱۳۰ھ جامع الشواہد، محولہ بالا، ص ۸۴

© rasailojaraid.com